سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقئ اُردو (ہند) نمبر ۲۳

معاشیات کی ماہیت و اہمیت

مترجمہ

جناب ابو سالم صاحب ایم اے (علیگ)

شائع کردہ

انجمنِ ترقئ اُردو (ہند) دہلی

پہلی بار ۱۹۴۵ء قیمت مجلد ہے بلا جلد ۱۲

مطبوعہ ہمدرد برقی پریس دہلی۔

عنوان نو

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقئ اردو (ہند) نمبر ۲۳

معاشیات کی ماہیت و اہمیت

مترجمہ

جناب ابو سالم صاحب ایم۔ اے (علیگ)

شائع کردہ

انجمنِ ترقئ اردو (ہند) دہلی

پہلی بار ۔ ۱۹۴۵ء ۔ قیمت مجلد تین روپے، بلا جلد دو روپے عہ

فہرست مضامین

مطبوعہ

ہمدرد برقی پریس دہلی

موضوع

اس مقالے کا مقصد معاشیات کی ماہیت اور اہمیت جتاناہی. اس لیے ضروری ہی کہ ہم یہ جان لینے کی کوشش کریں کہ معاشیات کیا اور اس کا موضوعِ بحث کیا ہی؟

بادی النظر میں تو یہ کام بہت ہی سہل معلوم ہوتا ہی۔ لیکن حقیقتاً سہل نہیں۔ معاشیات کے ماہرین کی کوششوں سے پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں معاشی کلّیات کا ایسا ذخیرہ تو ضرور جمع ہوگیا ہی جن کی سچائی اور اہمیت ناواقف یا کج فطرت افراد کے علاوہ سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ان کلیات کے مشترک موضوع کی حقیقت کیا ہی؟ اس سوال کا کوئی متفق علیہ جواب دنیا مشکل ہی۔ معاشیات کی معیاری کتابوں میں معاشیات کے بنیادی اصولوں کی تصریح وتشریح تقریباً سبھی مصنف ایک ہی طرح کرتے ہیں۔ یا اگر باہم کچھ اختلافات نظر بھی آتے ہیں تو بہت ہی جزوی اور غیر اہم۔ لیکن موضوع کی بحثوں میں اب بھی بہت ہی نمایاں اختلافات کا پتا چلتا ہی۔

یہ نہ تو کوئی غیر متوقع بات ہی اور نہ علم معاشیات کی تنقیص کا باعث۔ کیوں کہ جیسا کہ مِل نے تقریباً ایک صدی پہلے کہا تھا "کسی علم یا فن کی تعریف کا یقین ہمیشہ اس کے وجود میں آجانے کے بعد

ہی ہوتا ہے پہلے نہیں۔ کسی شہر کی فصیل کی طرح جو ہمیشہ اس لیے تعمیر کی جاتی ہے کہ ان عمارتوں کا احاطہ کرے جو پہلے سے موجود ہیں نہ اس لیے کہ ان کا بھی احاطہ کرے جو بعد کو وجود میں آجائیں۔" اور سچ تو یہ ہے کہ کسی علم یا سائنس کی ماہیت ہی اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ جب تک ارتقا کی ایک معین منزل پر نہ پہنچ جائے اس کے موضوع کی وسعت کا تعین نہ ہو سکے۔

سود کے جواز یا عدم جواز کی بحثیں، تجارت درآمد و برآمد کے فرق کے پیدا کردہ مسائل کا مطالعہ - یہ ہیں وہ اولین سوالات جن کا حل دریافت کرنے کی کوششوں میں معاشیات کی بنیاد پڑی۔ پھر یہ کون سی تعجب کی بات ہے کہ ہمارا یہ فن اب کہیں جاکر اس منزل پر پہنچ سکا ہے کہ ہم اس کڑی کا پتا معلوم کر سکیں جو ان مختلف النوع مسائل کو ایک ہی رشتے میں منسلک کرتی ہے اور اس ایک اہم مسئلے کا تعین کر سکیں جو ان سب تحقیقات کا مشترک موضوع ہے۔ ارتقا کی اس منزل پر پہنچنے سے معاشیات کی ماہیت کی کھوج کی کوشش کرنا ناکامی کو دعوت دینا تھا اور محض تضیعِ اوقات۔

لیکن اب کہ ہم نے یہ منطقی تعلق دریافت کر لیا ہے اور یہ جان لیا ہے کہ معاشیات کے بنیادی مسائل ایک ہی سوال کے مختلف پہلو ہیں اور ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں تو اب موضوع کی واضح حد بندی کی کوششیں بے کار اور بے معنی نہیں۔ اب نظری معاشیات کی مزید ترقی کے لیے یہ بات ناگزیر ہے کہ ہم اس کے مقصد کا یقین بالکل صحیح طریقے سے کر لیں۔ اب ہم جن مسائل کا حل

تلاش کرتے ہیں وہ محض ذہنی تجسس کے رہین منت نہیں۔ نظری معاشیات میں اب بھی بعض خلا ہیں، اس کے توضیحی اصول اب بھی بعض مسائل کو حل کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ ان خلاؤں کو پُر کرنا، اور ان توضیحی اصولوں کے اطلاق کے دائرے کو وسیع تر کرنے کے ذرائع ڈھونڈھنا معاشیات کی مزید ترقی کے لیے اب موخرالذکر امور لابدی ہیں۔ اب بھی ہم اگر معاشیات کے بنیادی موضوع کا تعین نہ کر سکیں اور واضح طور پر یہ نہ سمجھ لیں کہ کس قسم کے مسائل معاشیات کے دائرۂ تحقیق سے باہر ہیں تو غلط راہوں پر چل نکلنے کا اندیشہ ہے۔ موضوع کے تعین کی عدم موجودگی میں اس کا بڑا اندیشہ ہے کہ ہمارے ماہرینِ معاشیات ایسے مسائل میں الجھ جائیں گے جن کا معاشیات سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جن علمی مراکز میں اس بنیادی مسئلے کا ایک صحیح جواب حاصل ہو چکا ہے وہاں نظری معاشیات کے اہم مسائل بھی نسبتاً آسانی سے حل ہو جاتے ہیں اور پھر اگر ہم اپنے دریافت کردہ حلوں کو نتیجہ خیز طریقے پر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ معاشی کلیات کا عملی زندگی سے کیا رشتہ ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم معاشی کلیات کی اساسی حقیقت اور ان کے طلاق کی ٹھیک ٹھیک حدیں متعین کر لیں۔ اس بحث کے پیش نظر ہم اب معاشیات کی ایک جامع و مانع تعریف کی تلاش کا کام بغیر کسی پس و پیش یا ہچکچاہٹ کے شروع کر سکتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ کام نرا نظری اور عمل سے بالکل بے تعلق معلوم ہوتا ہے

معاشیات مادی خوش حالی کے اسباب کی تشریح و توضیح کا

نام ہے۔ معاشیات کی بہت ساری تعریفوں میں غالباً اسی تعریف کو قبول عام کی سند مل سکے گی۔ کم سے کم اینگلوسیکسن ممالک میں تو اکثریت اس کی حمایت کرے گی۔ یہ عنصر پروفیسر کینن اور مارشل کی تعریفوں میں مشترک ہے۔ پیرٹو (Panto) نے بھی جو اور کتنی ہی باتوں میں ان دونوں انگریز مصنفین سے بہت ہی مختلف خیالات رکھتا ہے اس تعریف کو استعمال کی عزت بخشی ہے۔ جان بیٹس (Jan Betan) کلارک کی تعریف میں بھی یہ پہلو موجود ہے۔

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تعریف عملاً ہمارے عنوان کی وضاحت کے لیے کافی وشافی ہے۔ روزمرہ کی گفتگو میں بلاشبہہ "معاشی" 'مادی' کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ "معاشی تاریخ"، "معاشی اور سیاسی مفاد کا تصادم" اور اس طرح کے کتنے ہی مواقع پر اس لفظ کے استعمال سے عوام یقیناً وہی مطلب سمجھتے ہیں جسے ہم "مادی" کے استعمال سے بھی واضح کر سکتے ہیں اور اس لیے یہ تعریف بہ ظاہر بہت ہی معقول نظر آتی ہے۔ بلاشبہ بعض مباحث اس تعریف کی حد سے باہر نظر آتے ہیں لیکن تعریف تو کوئی بھی قطعی جامع و مانع نہیں ہوتی۔ کچھ ایسی چیزیں ضرور باقی رہ جاتی ہیں جنھیں ہم نہ قطعاً خارج کر سکتے ہیں اور نہ شامل کر سکتے ہیں۔ اس تعریف میں بھی بہ ظاہر صرف یہی کمی نظر آتی ہے۔

لیکن اس طرح کی کسی تعریف کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کا فیصلہ ہم صرف اس طرح نہیں کر سکتے کہ آیا وہ روزمرہ کے استعمال سے مناسبت رکھتی ہیں یا نہیں۔ ایسی تعریفوں کے جواز یا عدم جواز

کے فیصلے کا انحصار تو صرف اس پر ہوگا کہ وہ اس علم کے اہم کلیات کے بنیادی موضوع کو ایک ساتھ بیان کر سکتی ہیں۔ اور اگر ہم اس تعریف کو اس معیار پر جانچیں تو ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ اس میں ایسی خرابیاں ہیں جنھیں ہم کسی طرح جزوی یا غیر اہم نہیں قرار دے سکتے۔ اس کے برخلاف یہ تعریف بعض انتہائی اہم کلیات کے موضوع کی اہمیت اور وسعت دونوں کو ہی تقریباً قطعی طور پر نظر انداز کر دیتی ہے۔

آئیے نظری معاشیات کے کسی اہم پہلو کو لے لیں اور دیکھیں ہماری یہ تعریف کس حد تک اس پہلو کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس بات سے ہم سب متفق ہو جائیں گے کہ اجرتوں کا مسئلہ، معاشی تفتیش کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں کیا ہم ان کے متعلق یہ فرض کر سکتے ہیں انسان کی مادی خوش حالی سے متعلق ہیں۔

اجرت اس معاوضے کو کہتے ہیں جو ایک آقا کی نگرانی میں ایک متعین شرح پر کوئی کام کرنے کے لیے ملے۔ اور اگر اس لفظ کی تعریف میں صحت کا پورا لحاظ رکھا جائے تو اس کا اطلاق صرف مزدوروں کی محنت کے معاوضے پر محدود کیا جا سکتا ہے اور عام معاشی تخیل میں اس لفظ کا اطلاق نفع کے علاوہ محنت کے معاوضے پر ہوتا ہے۔ بعض اجرتیں ایسے کاموں کا صلہ ہوتی ہیں جن کی بابت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس خوش حالی میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً گندی نالیاں صاف کرنے والے مہتر کی اجرت۔ یہ صحیح ہے لیکن اتنی ہی صحیح یہ بات بھی ہے کہ بعض اجرتوں کو مادی خوش حالی سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ مثلاً باجہ بجانے والوں کی محنت کا معاوضہ۔ لیکن عملی زندگی

ہیں دونوں ہی کام اپنی قیمت رکھتے ہیں اور دوسری خدمات کے صلے میں یہ کام لیے اور کیے جاتے ہیں۔ اجرتوں کے تعین سے متعلق ہم جو بھی نظریہ قائم کریں اس کا اطلاق ان دونوں قسم کے کاموں پر مساوی طور سے ہونا چاہیے۔ اس نظریے کی توضیحات کسی طرح بھی ان اجرتوں تک محدود نہیں جو ان کاموں کے عوض میں دی جاتی ہیں جن سے مادی خوش حالی میں اضافہ ہوتا ہے خواہ ہم "معاشی خوش حالی" سے کچھ ہی کیوں نہ مراد لیں۔

اجرتیں بعض چیزیں خریدنے کے کام میں لائی جاتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس پہلو پر زور دے کر اپنی زیر بحث تعریف کے لیے وجہ جواز ڈھونڈھ لیں۔ اجرتیں کمانے والے کا کام دوسروں کی معاشی خوش حالی میں اضافہ کرنا ہو یا نہیں۔ یہ اجرتیں خود اس کی معاشی خوش حالی میں اضافہ کرتی ہیں اور اس لیے "نظریۂ اجرت" ہماری زیر بحث تعریف معاشیات کے تحت میں آجاتا ہے لیکن یہ بہت ہی لچر سی دلیل ہوگی۔ اجرت پانے والا ایک مزدور اپنی اجرت سے روٹی بھی خرید سکتا ہے اور سینما کا ٹکٹ بھی۔ ایک نظریہ اجرت جو ان تمام اجرتوں کو جو "غیر مادی" کاموں کے صلے میں ملیں یا ان پر صرف کی جائیں نظر انداز کردے تو یہ بھی ایک ناقص اور غلط حد بندی ہوگی۔

معاشیات کے موضوع کو خواہ کتنا ہی محدود کر دیا گیا ہو، لیکن کسی ماہر معاشیات نے "اجرت" کو اس طرح قطعی محدود نہیں کیا ہے۔ پروفیسر کینن جیسے ماہر استاد معاشیات نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ کہ "معاشیات جنگ" دو متضاد تصورات جمع ہو جاتے ہیں۔ بہ ظاہر پروفیسر کینن کی دلیل

یہ ہوگی کہ معاشیات کا تعلق مادی خوش حالی کے اسباب کی دریافت سے ہے اور لڑائی ان ذرائع کو تباہ کرتی ہے۔ اس لیے لڑائی معاشیات کے موضوع کا جزو نہیں ہو سکتی مگر یہ قطعاً صحیح نہیں کہ معاشیات سے واقفیت لڑائی کے مسائل حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ خود پروفیسر کینن نے اپنی ایک کتاب کے ذریعے یہ بات نہایت واضح طور پر ثابت کردی ہے کہ وہ لوگ جن کے ذمے لڑائی کے لیے قوم... کی تنظیم کا کام کیا جاتا ہے معاشیات کی مدد کے بغیر غالباً پوری طرح کام یاب نہیں ہو سکتے۔ اور عجیب ترین بات یہ ہے کہ پروفیسر کینن نے زیر بحث رائے کا اظہار ایک ایسی تصنیف میں کیا ہے جس میں کسی قوم کی جنگی تنظیم کے بعد جو دشوار مسئلے پیدا ہوتے ہیں...... ان کو حل کرنے کے لیے معاشی تحلیل کے طریقے استعمال کیے گئے ہیں۔

اس تعریف کی منطقی کم زوریوں اور اس کے نقائص سے بالکل قطع نظر عہد حاضر کے انگریز ماہرین معاشیات کا اس تعریف کو قبول کر لینا یوں بھی کچھ عجیب سی بات ہے۔ تقریباً ان تمام معاشیین نے "بار آوری" (Productivity) کی ایک غیر مادی تعریف کی ہے۔ مگر سمتھ نے نتیجہ خیز اور بے نتیجہ محنت میں ضرور امتیاز کیا تھا اور اس کے نزدیک بار آوری کا معیار تھا کسی مادی یا مفید چیز کی تخلیق۔ "سوسائٹی کی بعض وقیع ترین جماعتوں کی محنت گھریلو نوکروں کی محنت کی طرح بار آور نہیں ہوتی اس محنت کے نتیجے کے طور پر کوئی مستقل چیز جو محنت کے اختتام کے بعد بھی باقی رہے یا کوئی خرید و فروخت کے قابل چیز وجود میں نہیں آتی.... مثلاً بادشاہ اور اس کا تمام وہ عملہ جو عدالت اور جنگ سے متعلق ہو

بے نتیجہ کام کرنے والے ہیں۔ اس طبقے میں ہمیں بعض سنجیدہ اور اہم ترین اور غیر اہم بلکہ یقیناً حقیر کاموں کو بھی شامل کرنا پڑے گا، پادری، وکیل، اطبا، مصنفین، کھلاڑی، مسخرے، موسیقار، گانے اور ناچنے والے وغیرہ سب اسی زمرے میں شامل ہیں"۔ عہد حاضر کے معاشین نے اور پروفیسر کینن نے جن کا نام ان کی صف اول میں ہے۔ "بارآوری" کی اس تعریف کو قطعاً ناکافی سمجھا ہے۔ جب تک کوئی چیز آزاد یا جماعت کی طلب کا مرکز بن سکے خواہ وہ ناچنے اور گانے والوں کی محنت ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے نزدیک نتیجہ خیز ہے پھر بارآوری کا آخر معیار کیا ہے۔ کیا مادی خوش حالی کیوں کہ نغمہ و سرود سے تاجر کا دل سرور سے لبریز ہو جاتا ہے اور اس میں ایک نئی روح پھونک جاتی ہے جس کی مدد سے وہ مادی اشیا کی پیداوار کی زیادہ بہتر تنظیم کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی لچر سی بات ہے اس قسم کی محنت کو بارآوری صرف اس لیے کہتے ہیں کہ لوگ اس کے لیے ایک قیمت ادا کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ کیوں کہ بعض افراد کے لیے ان محنتوں کی ایک متعین اہمیت ہوتی ہے اور اس مسئلے میں ایڈم اسمتھ کے ہم خیال ..... اور موجودہ عہد کے معاشیین میں بہت ہی نمایاں اختلاف ہے۔ عہد حاضر کے ماہرین معاشیات اس محنت کو بھی بارآور تصور نہیں کرتے جو کوئی ایسی مادی چیز وجود میں لائے جس کے لیے کوئی شخص کوئی قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں۔ یہی نہیں اب تو اختلاف اس سے بھی آگے پہنچ چکا ہے۔ پروفیسر فشر اور بعض دوسرے معاشیین نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ایک مادی چیز سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اسے بھی ہم غیر مادی استعمال کی مثال سمجھ سکتے ہیں۔ اپنے گھر سے، اپنے

خدمات یا گانے والے کے گیت ، ان سب سے جو آسودگی حاصل ہوتی ہے
پیدا ہوتے ہی فنا ہو جاتی ہے۔"

لیکن اگر یہ سچ ہے تو کیا یہ گمراہی نہیں کہ ہم معاشیات کو اب تک مادی خوش حالی کے اسباب کے مطالعے ہی سے متعلق سمجھتے ہیں۔ ایک گانے والے کی خدمات دولت کی ایک شکل ہیں۔ معاشیات ان خدمات کی قیمتوں کے تعین سے بحث کرتی ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے وہ ایک باورچی کے کام کی اجرت کے تعین سے قوانین یا اصولوں کا پتا لگانے کی کوشش کرتی ہے۔ معاشیات کا تعلق خواہ کسی بھی چیز سے ہو یہ قطعی ہے کہ وہ فی نفسہٖ مادی خوش حالی کے اسباب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

معاشیات کی اس تعریف کے بقا میں زیادہ تر تاریخی اسباب کو دخل ہے یہ گذشتہ اثرات کی آخری نشانی ہے۔ انگریز ماہرین معاشیات نے عام طور پر اصطلاحات کے مسائل سے دلچسپی نہیں لی۔ جہاں کہیں بھی انھیں تعریف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو انھوں نے اکثر و بیش تر بغیر رد و قدح کے کسی پرانی کتاب سے ایک تعریف اختیار کر لی ہے لیکن جہاں تک پروفیسر کینن کا تعلق ہے ان کے پاس اس تعریف کے اختیار کر لینے کے اور دلائل بھی ہیں۔ آئیے ان دلائل پر ایک نظر ڈالیں۔

کسی تعریف کی بناے منطقی کا پتا عموماً اس کے استعمال سے چلتا ہے۔ پروفیسر کینن نے "اکیلے انسان اور سوسائٹی کے ہاتھوں دولت کی بنیادی شرطوں" کے عنوان پر بحث کے سلسلے میں اس تخیل سے فائدہ اٹھایا ہے کہ کیا چیز معاشی ہے اور کیا نہیں اور یہ واقعہ ہے محض اتفاق نہیں کہ اگر ہم معاشیات کی تفتیش اس نقطۂ نظر سے کریں تو معاشیات کی یہ "مادی" تعریف بہت ہی

معقول نظر آتی ہے۔

پروفیسر کینن نے اپنی بحث کی ابتدا ایک اکیلے آدمی کے افعال کے مطالعے سے شروع کی ہے جو سوسائٹی سے بالکل الگ تھلگ زندگی گزار رہا ہے اور یہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ کون کون سی شرطیں دولت کا تعین کریں گی۔ یعنی کن چیزوں پر اس کی مادی خوش حالی کا دار و مدار ہوگا۔ ایسے مقصد کے حصول کے لیے ظاہر ہے انسانی افعال کی یہ دوگونہ تقسیم "معاشی" اور "غیر معاشی" افعال۔ وہ افعال جو مادی خوش حالی میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں اور وہ جو "غیر مادی" خوش حالی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ایک مناسب تقسیم معلوم ہوتی ہے۔ اگر رابن سن کروسو آلو کھودنے کا کام کر رہا ہے تو ظاہر ہے وہ "معاشی" یا مادی آسانی کے سامان فراہم کرنے کی فکر میں ہے لیکن اس کا اپنے توتے سے دل بہلانے کے لیے بات چیت کرنا "غیر معاشی" ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے جس سے ہم آیندہ بحث کریں گے۔ یہاں مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ اس سلسلے میں یہ تقسیم یا امتیاز بے معنی اور مہمل نہیں۔

لیکن اب یہ فرض کیجیے کہ کروسو کو اس کے جزیرے سے نجات دلا دی جاتی ہے اور وہ وطن واپس پہنچ جانے کے بعد اسٹیج پر توتے سے گفتگو کرنا ہی اپنے لیے ذریعہ معاش بنا لیتا ہے۔ اب ظاہر ہے ان باتوں میں ایک معاشی پہلو پیدا ہو گیا اور اب کروسو چاہے اپنی یہ آمدنی آلو خریدنے میں صرف کرے یا فلسفے کی کتابوں کے۔ کروسو کی آمدنی اور اخراجات دونوں ہی سوسائٹی کے دوسرے افراد کی آمدنیوں اور اخراجات کی طرح معاشیات کا موضوع بن جاتے ہیں۔

پروفیسر کینن نے غلطی یہ کی ہے کہ انھوں نے یہ غور نہیں کیا کہ یہ تقسیم ایک ایسی سوسائٹی کے مسائل حل کرنے میں جو "مبادلہ" کی بنیادوں پر قائم ہو کس حد تک کارآمد ہو سکتی ہے۔ یہ سوال اس لیے اور بھی اہم تھا کہ معاشی کلیات عملی طور پر ایسی ہی سوسائٹی کے مسائل کے حل کرنے میں زیادہ کارآمد ہیں۔ اس کے بجائے پروفیسر کینن نے فوراً ہی اپنی توجہ ساری سوسائٹی کے لیے "دولت کی بنیادی شرطوں" کا پتا لگانے کی طرف پھیر دی ہے اور اس سوال سے تقریباً آنکھیں بند کر لیں کہ وہ سوسائٹی ذاتی ملکیت اور آزاد مبادلہ کی بنیادوں پر قائم ہے یا نہیں اور یہاں بھی ان کی تعریف اگر ہم اسے غائر نظر سے نہ دیکھیں معقول معلوم ہوتی ہے یعنی ہم جماعتی افعال کے سارے مجموعے کو دو حصوں، معاشی و غیر معاشی میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ بعض مادی خوش حالی میں اضافہ کے لیے ہوتے ہیں اور بعض نہیں۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ ایک اشتمالی شخص آبادی کی کل محنت کو دو مقاصد کے حصول کے لیے یوں تقسیم کرے کہ روٹی مہیا کرے، دوسرا سرکس کی دل چسپیاں فراہم کرے۔

لیکن یہاں اور اسی طرح کروسو کی مثال کے سلسلے میں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ایک بڑا بھاری اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ پروفیسر کینن نے "معاشی" اور "غیر معاشی" افعال کی تعریف بالترتیب متعین کی ہے کہ وہ افعال جو مادی خوش حالی میں اضافہ کریں اور دوسرے جو غیر مادی خوش حالی میں۔ ان تعریفوں کو اگر ہم بھی مان لیں تو پروفیسر کینن کے خیال کے مطابق یہ کہہ سکتے ہیں کہ سوسائٹی کی دولت کی کمی یا زیادتی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ وہ اپنے وقت کا کتنا حصہ مادی خوش حالی کی تلاش میں اور کتنا

غیر مادی خوش حالی کی تلاش میں لگاتی ہے لیکن لفظ "معاشی" کے روزمرّہ کے مفہوم کے مطابق بھی اور بحیثیت مجموعی قوم کے لیے ایک معاشی سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ دن اور رات کے ۲۴ گھنٹوں کو کس طرح ان دونوں مقاصد کے حصول کے لیے آپس میں تقسیم کیا جائے؟ گویا "معاشی" اور "غیر معاشی" کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے کا ایک معاشی مسئلہ جو اب بھی باقی ہے اور نظریۂ دولت کے اہم مسائل میں ہے۔ پروفیسر کینن کی تعریف سے تقریباً خارج رہ جاتا ہے۔

کیا یہ خود اس تعریف کے ترک کر دینے کے لیے کافی نہیں؟

۳۔ لیکن پھر ہم کدھر جائیں؟ اس وقت کا حل کرنا بہت دشوار نہیں۔ معاشیات کی مادی تعریف پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ہم ایک ایسے نکتے پر پہنچ گئے ہیں جس پر ہم دوسری، تعریف کی بنیاد رکھ سکتے ہیں جو ان تمام اعتراضات سے محفوظ ہوگی۔

آیئے اس سادہ ترین مثال پر پھر ایک نظر ڈالیں جس کے حل کرنے میں ہمیں یہ تعریف ناکافی معلوم ہوئی تھی یعنی ایک یکہ و تنہا آدمی کی مثال جسے کام اور آرام کے درمیان اپنے وقت کی تقسیم کا مسئلہ حل کرنا ہے۔ ابھی ہم نے تسلیم کیا ہے کہ اس تقسیم کا ایک معاشی پہلو ہے۔ وہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ان شرائط کے تعین میں مضمر ہے جو اس طرح کے تقسیم اوقات کو ضروری بنا دیتی ہیں۔ یہ چار ہیں: پہلی بات تو یہ کہ اس فرضی یکہ و تنہا آدمی کو کام اور آرام دونوں کی خواہش ہو۔ اس کے پاس ان دونوں مطلوب چیزوں میں سے کوئی بھی اتنی کافی مقدار میں

موجود نہ ہو کہ اس کا جی بھر جائے۔ تجربے یہ کہ وہ اپنے وقت کو یا اپنی آمدنی بڑھانے میں صرف کر سکتا ہو یا زیادہ آرام میں، اور یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ بعض غیر معمولی مستثنیات کے علاوہ، تمام حالتوں میں اس کی طلب روزی اور آرام کی مختلف شکلوں کے لئے مختلف ہوگی۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں چھانٹنا پڑتا ہے اور کفایت شعاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس طرح وقت اور ذرائع کے استعمال کو اس کی خواہشات سے ایک گہرا تعلق ہے اور یہ یہی معاشی پہلو ہے۔

یہ مثال معاشیات کے سارے شعبوں کے لئے یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ ایک ماہر معاشیات کے نقطۂ نظر کے مطابق انسانی زندگی کی چار بنیادی خصوصیتیں ہیں۔ ہمارے مقاصد مختلف ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے وقت اور ذرائع دونوں ہی محدود ہیں اور ساتھ ہی دونوں کو مختلف کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ اور ہماری مختلف خواہشیں مختلف اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، انسانی فطرت کو قدرت نے مختلف خواہشات اور تمناؤں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ یہ امیدیں اور یہ تمنائیں اسے مختلف کام کرنے کے لئے ابھارتی رہتی ہیں، لیکن ان تمام خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ہمیں جتنے وقت اور مواقع کی ضرورت ہے۔ وہ ہمارے پاس نہیں۔ زندگی مختصر ہے اور فطرت بخیل، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ بعض خواہشات کی تکمیل کی تمناؤں سے بھلا دیں۔ ہم زندگی کے ایام مختلف کام کرتے ہیں لگا سکتے ہیں۔ اور دوسروں سے بھی مختلف کام لے سکتے ہیں۔ لیکن مقاصد کی کثرت فی نفسہٖ معاشیات کے ایک طالب علم کی دل چسپی کے لئے کافی نہیں۔ اگر میں دو کام کرنا چاہتا ہوں اور میرے پاس دونوں کاموں کی انجام دہی کے لئے کافی وقت اور کافی وسائل موجود ہیں، جن

کی کسی دوسرے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تو میرے طرزِ عمل میں کوئی ایسا پہلو پیدا نہیں ہوتا جو معاشیات کے موضوع کے تحت میں آجائے۔

ذرائع کی قلت بھی فی نفسہٖ معاشی سوالات پیدا نہیں کرتی اگر آسودگی کے ذرائع مختلف خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال نہیں کیے جاسکتے تو کم ہوتے ہوئے بھی مقصد استعمال میں انتخاب کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، من و سلویٰ کا جو خوان آسمان سے آیا تھا، ممکن ہے اس کی مقدار قلیل رہی ہو لیکن اگر اس کا کسی اور چیز سے مبادلہ ممکن نہ رہا ہو، یا اس کے استعمال کو ٹالا نہ جاسکتا ہو، تو اس سے متعلق کسی ایسے عمل کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جسے معاشیات سے کوئی تعلق ہو۔

قلیل المقدار ذرائع کی مختلف مقاصد کے حصول کے لئے استعمال ہونے کی صلاحیت بھی بذات خود اس کی ضامن نہیں کہ اس سے ایسے سوالات پیدا ہوسکیں جو بحیثیت معاشیات کے طالب علم کے ہمارے غور و فکر کا موضوع بن جائیں۔ اگر ایک انسان کے لئے تکمیل یکساں طور پر اہم ہو اور ان کی تکمیل کے لئے اس کے پاس صرف ایک ہی ذریعہ ہو تو ظاہر ہے یہاں بھی انتخاب کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن جب وقت اور ذرائع محدود ہوں اور مختلف مقاصد کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہوں اور خود مقاصد کو ایک دوسرے پر فوقیت دی جاسکے تو ہمارے لئے انتخاب اور ترجیح کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا، اگر ہم اپنے وقت اور اپنے مادی ذرائع کو ایک مقصد کے حصول کے لئے استعمال کریں تو پھر ہم ان کو دوسرے مقصد کے سلسلہ میں استعمال نہیں کرسکتے۔ اگر مجھے

بھوک بھی ہو اور نیند بھی اور میرے پاس اتنا وقت نہ ہو کہ میں دونوں خواہشات کو پورا کرلوں تو مجھے اس پر اکتفا کرنا پڑیگا کہ میں تھوڑا سا سولوں اور تھوڑا سا کھالوں۔ اگر اپنی محدود زندگی میں آپ ماہر ریاضیات اور فلسفی دونوں ہی بننا چاہتے ہیں۔ لیکن ان علموں کے حصول کی رفتار ایسی نہیں کہ آپ دونوں میں مہارت تامہ حاصل کرلیں تو ان دونوں یا ان میں سے ایک علم میں مہارت کی خواہش کو کسی حد تک قربان کرنا پڑے گا۔

انسان کے مقاصد کے حصول کے لئے سارے ذرائع محدود نہیں، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جو اتنی کثیر مقدار میں موجود ہیں کہ ایک خواہش کی تکمیل کرنے میں یہ لازم نہیں ہوجاتا، کہ دوسری خواہشوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں ان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ہوا اس طرح کی ایک مفت کی چیز ہے۔ بعض خاص حالتوں کو چھوڑ کر ہوا کی ضرورت ہمارے وقت یا ذرائع کی کسی قربانی کی متقاضی نہیں ہوتی۔ سانس لینے سے یہ ضروری نہیں ہوجاتا کہ ہم ہوا کو کسی اور مقصد کے لئے استعمال نہ کرسکیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کی خواہشیں اتنی محدود ہوں کہ ان کے لئے ہر چیز مفت کی بن جائے اور کسی چیز کی بھی کوئی اہمیت نہ ہو۔

لیکن عام طور پر غیر محدود اور مختلف النوع مقاصد کے لئے انسانی جدوجہد وقت اور ذرائع کی عائد کردہ پابندیوں سے اس طرح بے نیاز نہیں ہوسکتی۔ ہمارے پاس وقت محدود ہے، دن رات میں صرف ۲۴ گھنٹے ہوتے ہیں۔ ان گھنٹوں کو کن کن کاموں میں لگائیں؟ ہمیں اس کا فیصلہ کرنے میں بعض کاموں کو بعض پر ترجیح دینی پڑتی ہے۔ دوسرے لوگ جو مدد ہمیں دیتے ہیں ان کی مقدار بھی محدود ہوتی ہے۔ مختلف خواہشات کی تکمیل کے لئے مادی ذرائع محدود

ہوتے ہیں - ہم جنت سے نکالے ہوئے لوگ ہیں- جن کے حصے میں نہ تو دائمی زندگی آتی ہے اور نہ پوری سیری حاصل کرنے کے لاتعداد ذرائع- اگر ہم ایک چیز پسند کرتے ہیں تو ہمیں مجبوراً دوسری چیزیں چھوڑنی پڑتی ہیں- جن سے ہم دوسرے حالات میں دست بردار ہونا پسند نہ کرتے- غرض مختلف درجوں کے مقاصد کے حصول کے لیے ذرائع کی قلت کا سامنا انسان کو زندگی میں تقریباً ہمیشہ کرنا پڑتا ہے-

قلیل المقدار ذرائع کے استعمال میں انسان کا طرزِ عمل کیا ہونا ہے؟ یہی مرکزی سوال معاشیات کے مختلف اجزا میں ربط اور اتحاد قائم کرتا ہے، جن مثالوں سے ہم نے اوپر بحث کی ہے وہ سب کی سب اس تصور سے نہایت آسانی سے ہم آہنگ ہوجاتی ہیں۔ باورچیوں کی خدمات، اور ناچنے والوں کی محنت دونوں ہی کی رسد ان کی طلب کے مقابلے میں محدود ہے- اور دونوں ہی اپنی محنت کو دوسرے کاموں میں لگا سکتے ہیں، نظریۂ اجرت پوری طرح اس تعریف کے تحت میں آجاتا ہے- معاشیاتِ جنگ بھی اس سے باہر نہیں، سوسائٹی کو لڑائی کے لئے منظم کرنے میں لازماً چیزوں اور افراد کی محنتوں کو بعض مقاصد کے حصول کی کوششوں سے آزاد کرکے دوسرے مقاصد کے حصول میں لگانا پڑتا ہے- کہ اس کے بغیر کامیاب تنظیم ممکن نہیں اور یہ ایک معاشی پہلو ہے- معاشیات کا طالب علم قلیل المقدار ذرائع کے استعمال کا مطالعہ کرتا ہے- رسد کی قلت کے لحاظ سے اشیا کے مختلف درجے قائم کیے جا سکتے ہیں- ان کی رسد کی قلت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے لیے ہم مختلف قیمتیں دینے کے لیے تیار رہتے ہیں- ان کی طلب میں اگر کسی وجہ سے کمی ہو جائے تو یہ چیز قیمت پر اثر انداز ہوتی ہے، اور اسی

۲۱

طرح اگر ان کی رسد میں اضافہ یا کمی ہو جائے تو ان کی قیمتوں میں تبدیلیاں
ہو جاتی ہیں۔ ان تبدیلیوں سے ان کی باہمی قیمتوں کے تناسب میں فرق
پیدا ہو جاتا ہے۔ معاشیات انھی مسائل سے بحث کرتی ہے۔

یہ بہت ضروری ہے کہ اس تعریف کا مفہوم ہم واضح طور پر سمجھ
لیں۔ معاشیات کا وہ تصور جو اسے مادی خوش حالی کے اسباب کا مطالعہ
سمجھتا ہے۔ ایک خارجی تصور ہے وہ انسانی عمل کی بعض قسموں سے تعلق
رکھتا ہے۔ مادی خوش حالی کی تلاش میں انسان سے جو عمل سرزد ہو صرف
وہی معاشیات کا موضوع ہو سکتا ہے۔ اور معاشیات کا انسان کے
دوسری طرح کے کاموں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کے برخلاف معاشیات
کے جس تصور کو ہم نے صحیح مانا ہے "تحلیلی" کہا جا سکتا ہے۔ اس تصور کے
ماتحت ہم انسانی کردار کی بعض قسموں ہی سے مطلب نہیں رکھتے، بلکہ
کردار کے ایک رخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اشیا کی کم یابی انسان کے کردار
پر بڑا اثر ڈالتی ہے۔ افراد کے کردار کا یہی پہلو معاشیات کا موضوع ہے۔ اس
طرح گویا انسان کا کوئی بھی فعل جس میں یہ پہلو موجود ہو، جہاں کسی ذریعے
کی کم یابی اس کے حصول مقاصد میں دقتیں پیدا کرے۔ معاشی کلیات
کے اطلاق کی حدود سے باہر نہیں۔ آلو پیدا کرنا ایک معاشی عمل ہے اور
فلسفہ کا مطالعہ ایک غیر معاشی عمل۔ ہمارا اختیار کردہ تصور معاشیات اس
تقسیم کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ ہاں چوں کہ ان دونوں مقاصد کے حصول کی
کوشش میں انسان کو اور دوسرے مقاصد سے دست بردار ہونا پڑتا ہے
اس لئے اس مسئلہ کا ایک معاشی پہلو ہے۔ معاشیات کے موضوع کے
تعین میں ہمیں اس کے علاوہ کسی اور حد بندی کی قطعی ضرورت نہیں۔

بعض اور مصنفین نے معاشیات کی اس مادی تعریف کو تو رد کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے موضوع پر ایک دوسری طرح کی پابندی عائد کر دی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ معاشیات کا تعلق ایک خاص طرح کے افعال سے ہے جو ہم سے صرف اس وجہ سے سرزد ہوتے ہیں کہ ہم موجودہ معاشی جماعت کے، جس کی بنیاد افراد کے باہم مبادلہ اشیا پر رکھی گئی ہے فرد ہیں۔ یعنی ایک مخصوص طرح کے ادارے کے رکن ہونے کی وجہ سے ہمارے افعال بعض شکلیں اختیار کرتے ہیں، اور معاشیات کا تعلق صرف انھی افعال سے ہے۔ پروفیسر امین نے خصوصاً اس تصور کی تشریح و وضاحت کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔

معاشیات کی جس تعریف کو ہم نے قابل قبول بنایا ہے، اسے اختیار کرتے ہوئے بھی یہ سچ ہے کہ معاشیات کے ایک طالب علم کی بیشتر توجہ کا مرکز وہ پیچیدگیاں ہیں جو ہماری موجودہ معاشی تنظیم کی پیدا کردہ ہیں یا جس میں افراد کے باہم دگر مبادلۂ اشیا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور ہمیں یہ تسلیم کر لینے میں بالکل جھجکنا نہیں چاہیے۔ گو ایک یکہ و تنہا آدمی کو قلت ذرائع کا اسی طرح سامنا کرنا پڑتا ہے، جس طرح باہمی مبادلے کے لیے منظم قوم کے افراد کو، اور اس لیے دونوں کے افعال یکساں طور پر معاشی تحقیق و تفتیش کا موضوع بن سکتے ہیں۔ لیکن معاشی تحلیل اور تجزیہ ایک ایسے آدمی کے لئے جو سب سے الگ تھلگ زندگی بسر کر رہا ہو بالکل غیر ضروری ہے، کروسو کے کردار کا مطالعہ مزید تحقیق کے سلسلے میں ممکن ہے بہت مفید ہو لیکن خود کروسو کے نقطۂ نظر سے یہ بالکل بے سود سا کام ہے۔ ایک اکیلے آدمی کو جن مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے وہ نسبتاً سادے اور آسان

ہوتے ہیں اور انھیں ہر فرد خود آسانی سے سوچ اور سمجھ سکتا ہے، اس کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ وہ معاشیات کی طول طویل بحثوں میں پڑے۔ ایسے ہی ایک محدود اشتمالی قوم کے مسائل کا مطالعہ اور آزاد معاشیات کے مسائل سے ان کا تقابل معاشیات کے ایک طالب علم کے لئے تو بڑی بصیرت کا باعث ہو سکتا ہے، لیکن ایسی قوم کی عاملہ کے ممبر معاشی کلیات سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کے سامنے معاشی مسئلہ صرف یہ ہے کہ وہ کس قدر ذرائع پیداوار ایک چیز کے حصول میں لگا سکتے ہیں اور کس قدر کسی دوسری چیز کے لیے؟

ہماری موجودہ معاشرت میں وہ چیزیں بنائی جاتی ہیں جن کی طلب ہو، انفرادی طور پر اگر کسی چیز کے لیے ایک ایسی قیمت دینے کو تیار ہیں۔ جو اس کے بنانے والے کے لئے کچھ مالی منفعت کا باعث ہو تو وہ چیز بنائی جائیگی ورنہ نہیں۔ مگر اشتمالی حکومت میں .... چیزوں کی ضرورت کے متعلق عاملہ کا اندازہ بھی ناطق فیصلہ ہوتا ہے۔ دولت پیدا کرنے والوں اور دولت کو صرف کرنے والوں کے فیصلے عاملہ کے فیصلوں کے تابع ہوتے ہیں۔ اس طرح انتخاب کا مسئلہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ قیمتوں کے ایک نظام کی مدد کے بغیر اگر ہم پیداوار دولت کی تنظیم کرنا چاہیں تو یہ مسائل کہ کون سی چیزیں بنائی جائیں گی اور کون سی نہیں، صرف حکومت ہی کے طے کرنے کے مسائل ہوں گے ٹھیک اسی طرح جیسے ایک پدر شاہی ریاست کا انتظام خاندان کے بزرگ ہی کی خواہشوں کے مطابق ہوتا۔

لیکن ایک ایسی قوم کے مسائل جو باہمی مبادلے کی بنیادوں پر قائم ہو، کہیں پیچیدہ ہوتے ہیں۔ افراد کے فیصلوں کے اثرات دور دور تک پہنچتے ہیں۔ اپنے رپوں کے ایک استعمال کو دوسروں پر ترجیح دینے سے آپ کی انفرادی زندگی پر کیا اثرات پڑیں گے، یہ ہر شخص معلوم کر سکتا ہے، لیکن یہ بڑا مشکل ہے کہ اپنے ایک فعل کے ان سارے نتائج کا احاطہ کیا جا سکے جو "قوم" کے دوسرے افراد پر اثر انداز ہوں گے۔ آپ اپنی آمدنی سے شراب پی ڈالیں یا کتابیں خرید لیں آپ کے انتخاب کی مضرت اور منفعت جہاں تک صرف آپ کی ذات کا تعلق ہے، آسانی سے آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔ لیکن آپ کے اس فیصلے یا انتخاب کا قوم کے افراد کی اجرتوں، منافع، دوسری اشیا کی قیمتوں درپیداوار کی تنظیم پر کیا اثر پڑے گا، یہ معلوم کرنا کچھ آسان نہیں۔

ہمیں غور و فکر کی انتہائی سخت محنتیں برداشت کر کے ہی ایسے کلیات کا پتا لگ سکتا ہے جن سے ہم قلت کے پیدا کردہ ان مسائل کا احاطہ کر سکیں، اور اسی لئے معاشی تحلیل ایک آزاد ملک و معاشرت کے لئے سب سے زیادہ مفید ہے۔ اکیلے آدمی کی معاشی زندگی میں یہ تحلیل غیر ضروری ہے۔ اور ایک اشتمالی ملک میں معاشی کلیات کی افادیت بہت ہی محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن جب افراد اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں بالکل آزاد ہوں، تو ایسی قوم ... کے لئے معاشیات کی افادیت کہیں زیادہ ہے۔

آزاد تبادلے والی قوم کی معاشی زندگی کا مطالعہ دلچسپ اور مفید ہے

لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ معاشیات کا موضوع صرف وہ مسائل ہیں جو ایک ایسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔ مبادلے کے لیے منتظم قوم میں انسانی کردار ذرائع کی قلت سے اسی طرح اثر پذیر ہوتا ہے جس طرح ایسی قوم کے باہر رہ کر۔ اور اسے ہم اتنی ہی آسانی سے معاشیات کی منطقی تقسیموں کا ایک جز سمجھ سکتے ہیں، مثلاً نظریہ قدر کے کلیات کا اطلاق ایک اکیلے آدمی یا ایک اشتمالی قوم کی عاملہ کے کردار پر بالکل یکساں ہوتا ہے، گو یہ صحیح ہے کہ ان سے مؤخرالذکر دو صورتوں میں مسائل کے سمجھنے میں بہت مدد نہیں لی جاتی۔ مبادلے کے پیدا کردہ وہ تعلقات کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک اتفاقی بات کہہ سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ قوم کی تنظیم میں اس اتفاقی خصوصیت کی موجودگی ہی ان تمام پیچیدگیوں کی خالق ہے جو معاشیات کے مطالعہ کو ایک دلچسپ مشغلہ بنا دیتی ہیں، لیکن پھر بھی اصل اور بنیادی چیز خود قلت اشیا ہی ہے اور یہ خصوصیت ایک ثانوی چیز ہے۔ باہمی مبادلہ کے مسائل ٹھیک طور سے سمجھنے کے لئے ہمیں انتخاب کے اصولوں کو پہلے سمجھنا پڑتا ہے۔ اور یہ پہلو ایک اکیلے آدمی کے کردار کا مطالعہ کرتے وقت نہایت ہی وضاحت سے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً قوم کے مختلف افراد فرض کیجئے موٹریں خریدتے ہیں، ہم بہ آسانی سے پتا لگا نہیں سکتے کہ انھوں نے کس چیز یا کس خواہش سے دست کشی کی ہے تاکہ اپنے مادی ذرائع کو موٹر کی خرید کے لئے استعمال کرسکیں۔ لیکن ایک فرد کے کردار کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ بات نسبتاً زیادہ آسانی سے معلوم ہوسکتی ہے کہ ایک خواہش کی تکمیل کن دوسری خواہشوں کی عدم تکمیل کا باعث بنی ہے۔

پروفیسر امینن اس طرح کے مطالعہ کو معاشیات کے مطالعہ کے لیے ایک معاون کی حیثیت سے تو قبول کرنے کو تیار معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ اسے معاشیات کی بنیاد بنانے کو تیار نہیں، کیونکہ ان کے نزدیک معاشیات کے موضوع کا تعین ان مسائل کے مطالعہ کی روشنی ہی میں ہونا چاہیے۔ جن سے رکارڈ نے بحث کی ہے۔ یہ خیال صحیح ہے اور قابلِ تعریف ہے کہ علم کی تعریف ایسی ہونی چاہئے جو موجود اور معلومہ صورتوں کا احاطہ کرے نہ یہ کہ وہ من گھڑت قسم کی حدود قایم کرے۔ لیکن یہاں تو بہت جائز طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ کہ آخر رکارڈ موضوع کے تعین کے لئے آخری منزل کیوں ہو؟ کیا یہ بات واضح نہیں ہو چکی ہے کہ رکارڈ کے نظام معاشیات کی بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ بازار میں قدروں کے تعین کو ہی بنیادی مسئلے کا درجہ دیتا ہے۔ اور افراد کے اندازۂ قدر و قیمت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا؟ اور کیا حال کے نظریات قدر کا سب سے قابل تعریف پہلو۔ یہی نہیں کہ انھوں نے اس دقت کو حل کر لیا ہے، بازار کی قیمتوں کے تعین کو وہ افراد کے اندازۂ قدر و قیمت پر مبنی سمجھتے ہیں۔ اور اول الذکر کے تعین سے بحث کو طول دینے کی ضرورت نہیں رہتی ؟ ...

. . . .

.... آیئے ذرا اب ان دونوں تعریفوں کا باہم مقابلہ کریں۔ بادی النظر میں ان دونوں تعریفوں میں کوئی بڑا اختلاف نہیں معلوم ہوتا۔ ایک تعریف کے مطابق معاشیات کا موضوع انسانی کردار کا وہ پہلو ہے۔ جو قلت ذرائع کا رہینِ منت ہے۔ اور دوسری تعریف

کے مطابق معاشیات کا موضوع انسان کی مادی خوشحالی کے اسباب کا مطالعہ ہے۔ لیکن مادی خوش حالی کا دار و مدار تو ذرائع کی ہی قلت یا بہتات پر ہے۔ پھر کیا دونوں تعریفیں کم و بیش ایک سی ہی نہیں؟ لیکن ایسا خیال کرنا غلطی ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ مادی ذرائع کی قلت انسان کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے، لیکن خود ہمارے وقت کی کمی، دوسروں کی خدمات کی کمیابی بھی اتنی ہی اہم چیزیں ہیں، اسکول کے استادوں کی خدمات کی کمیابی، یا گندی نالیاں صاف کرنے والے مہتر کی خدمات کی قلت دونوں کا ایک معاشی پہلو ہے۔ خدمات مادی اجسام کے دست و پا کی جنبش کا نتیجہ ہیں۔ یہ یا اسی قسم کی دوسری باتیں کہہ کر اس تعریف کو سہارا دیا جاسکتا ہے۔ یہ پھر بھی ایک گمراہ کن دفاع ہے۔ کیونکہ مادی چیزوں کا مادی ہونا ہی انھیں معاشی اشیا کا رتبہ نہیں دے سکتا، بلکہ یہ ضروری ہے کہ لوگ ان چیزوں کی قدر کریں۔ اور ان کے لیے کوئی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ ضرورتوں یا خواہشوں کو پورا کرنے کی صلاحیت معاشی چیز ہونے کی ناگزیر شرط ہے۔ معاشیات کی یہ "مادی" تعریف معاشیات کی ایک غلط تصویر پیش کرتی ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ معاشیات کی دونوں ہی تعریفیں اس کے موضوع کا پوری طرح احاطہ کر لیتی ہیں تو بھی یہ مانے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ موخر الذکر تعریف معاشیات کی ماہیت کی شافی تشریح کرنے سے قاصر ہے اور اس کے رد کر دینے کے خلاف کوئی بھی وزنی دلیل نہیں، لیکن یہاں ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔ کہ ہم

صرف ایک تعریف کو رد کر رہے ہیں، علم کے اس مجموعہ کو نہیں جسے بیان کرنے کے لیے یہ تعریف استعمال کی گئی تھی، جہاں تک اس تعریف کے ماننے والوں کے عمل کا تعلق ہے۔ ہم ان کے کاموں کو اپنی نئی اور صحیح تر تعریف سے بالکل ہم آہنگ سمجھتے ہیں مثال کے طور پر پروفیسر کینن کو ہی لے لیجیے ان کے نظام معاشیات کا ایک بھی اہم کلیہ ایسا نہیں جو ہماری اختیار کردہ تعریف سے بے میل ہو۔

اور پھر خود اس مثال کو ہی لے لیجیے، جسے پروفیسر کینن نے اپنی تعریف کی وضاحت کے لیے استعمال کیا ہے، یہ مثال ہماری اختیار کردہ تعریف سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

پروفیسر کینن کہتے ہیں "معاشیات" کے ماہرین اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ سوال کہ شکیپیئر کے ڈرامے بیکن نے لکھے ہیں یا نہیں، ایک معاشی سوال نہیں اور اس خیال کے حامیوں کو ان کی رائے کے صحیح ثابت ہونے سے جو خوشی یا مسرت حاصل ہوگی وہ معاشی آسودگی کی مثال نہ ہوگی..... لیکن ہر شخص اس بات سے اتفاق کرے گا کہ اگر بیکن اور شیکسپیر کی اولاد ان کے حقوق کے متعلق آپس میں جھگڑنے لگے تو یہ ایک معاشی سوال ہوگا۔

پروفیسر کینن کا یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ کیا اس لئے کہ کسی کتاب کے جملہ حقوق کی ملکیت مادی خوش حالی میں اضافے کا باعث ہے؟ لیکن اس طرح جو رقم ملے وہ تبلیغی کام میں لگائی جا سکتی ہے۔ اس بحث کا ایک معاشی پہلو

صرف اس لئے ہو کہ جملہ حقوق کے تحفظ کے قوانین سے طلب کے مقابلہ میں شکسپیر کے ڈراموں کی رسد میں کمی واقع ہو جائے گی اور اس طرح ان کے مالکوں کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے قلیل المقدار ذرائع آسودگی حاصل ہو جائیں گے۔ جو اِن قوانین کی غیر موجودگی میں کسی اور کے ہاتھ آجاتے ہیں۔

(۲)

مقصد و منہاج

ہم معاشیات کے موضوع کا تعین کر چکے ہیں، اب ہمیں اختیار کردہ تعریف کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اِس باب میں ہم اس سوال سے بحث کریں گے کہ نظری معاشیات اور معاشی تاریخ میں مقاصد اور ذرائع کی کیا نوعیت ہوتی ہے۔

پہلے مقاصد کی بحث کو لیجیے۔ جب مختلف مقاصد کے حصول میں انسان کو ذرائع کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس کا عمل انتخاب کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ابھی ہم نے یہ دیکھا ہے کہ انسانی کردار کا یہ پہلو ہی معاشیات کا موضوع ہے۔ اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے معاشیات ان سے تعرض نہیں کرتی۔ اسے اس سے بحث نہیں کہ کون سا مقصد اچھا ہے یا بُرا، کون سی خواہش پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ۔ اگر کسی مقصد کا حصول قلیل المقدار ذرائع کے استعمال پر مبنی ہے، تو معاشیات کے ایک طالب علم کو اس سے دل چسپی ہوگی، کیوں کہ اس کی تحقیقات کا موضوع ہی یہ ہے کہ ہماری خواہشات کی تکمیل ذرائع کی کمیابی پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے، یا اسی بات کو ہم

دوسری طرح یوں کہ سکتے ہیں کہ ذرائع آسودگی کی کمیابی کی صورت میں ہم انھیں مختلف مقاصد کے حصول میں کس تناسب سے استعمال کرتے ہیں۔

اس لئے کسی مقصد کو معاشی یا غیر معاشی کہنا ایک کھلی غلطی ہے، ماہرین معاشیات کے ایک طبقے میں "معاشی آسودگی" کی بحث سے بڑی دل چسپی لی جاتی ہے۔ لیکن یہ بحث معاشیات کے بنیادی مقصد سے بہت ہی دور ہے۔ آسودگی کسی عمل کے اختتام کا نتیجہ ہے، اس عمل کا جزو نہیں جو کسی مقصد کے حصول میں ہم سے سرزد ہوتا ہے، اور معاشیات کو عمل سے تعلق ہے، مقصد کی نوعیت سے نہیں۔ یہ کہنا تو شاید صحیح نہیں ہوگا۔ کہ "معاشی آسودگی" کا تصور ہی ممکن نہیں کیونکہ ہم اس اطمینان یا خوشی کو جو قلیل المقدار ذرائع کے استعمال کے نتیجہ کے طور پر حاصل ہو یہ نام دے سکتے ہیں اور اسے اس آسودگی سے ممیز بھی کر سکتے ہیں جو تمام تر داخلی ہو۔ مثلاً گرمیوں کی چھٹیوں سے لطف اندوز ہونے کو ہم "معاشی آسودگی" کا باعث تصور کر سکتے ہیں اور اس کی دل چسپیوں کی یاد سے جو سکون حاصل کیا جائے، اُسے "غیر معاشی آسودگی" کا نام دے سکتے ہیں، لیکن ذرائع کی کمیابی ہمارے کردار کے تقریباً ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ تصور کچھ مفید معلوم نہیں ہوتا اور پھر اس نکتے کے پیش نظر کہ یہ تصور ہماری اختیار کردہ تعریف سے ہم آہنگ نہیں زیادہ بہتر شکل یہی ہے کہ ہم اس تصور سے بچتے ہی رہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشیات کا ایک طالب علم انسان

کے صرف ادنٰی درجہ کے مقاصد سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہ خیال بھی صحیح نہیں۔ ہمیں مقاصد کی نوعیت سے کوئی سروکار نہیں وہ اچھے ہوں یا بُرے، "مادی" ہوں یا "غیر مادی" (اگر مقاصد ان صفتوں سے متصف کیے جا سکتے ہیں)

مقاصد کے حصول کے ذرائع محدود ہیں، ان کی کمیابی حصول مقاصد کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے۔ ہمیں بعض مقاصد سے دستکش ہونا پڑتا ہے، بعض خواہشوں کو ادھورا رکھنا پڑتا ہے، ہمیں بحث کے صرف اسی پہلو سے تعلق ہے، اگر ایک طرح کے مقاصد کا حصول ہمیں اس پر مجبور کر دیتا ہے کہ بعض دوسرے مقاصد کی تکمیل سے دست بردار ہو جائیں۔ تو یہ سوال ایک معاشی پہلو رکھتا ہے اور بحیثیت معاشیات کے ایک طالب علم کے ہمیں اس پہلو سے دلچسپی ہوگی۔

معاشی تحلیل عملاً کس قسم کے مسائل سے بحث کرتی ہے؟ اگر ہم اس سوال کا ایک اطمینان بخش جواب دریافت کرلیں تو ہم ان تمام غلط فہمیوں سے محفوظ ہو جائینگے، جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ فرض کیجئے ہم ایک عیش پسند جماعت کی زندگی کا جائزہ لیں، تو کیا ان کی ادنٰی قسم کی خواہشات اور ان کی تکمیل کے ذرائع معاشی تحلیل کا موضوع نہیں بن سکتے۔ کیا ذرائع کی قلیل المقدار ہونے کی شکل میں ان کا عمل انتخاب کے علاوہ کوئی اور شکل اختیار کر لیتا ہے؟ کیا انھیں ایک پست خواہش کی تکمیل کے لیے بعض دوسری پست خواہشوں کی تکمیل سے ہاتھ نہیں اٹھا لینا پڑتا،

اور اگر انھیں ایسا کچھ کرنا پڑتا ہو تو ان کا کردار مقاصد کی پستی اور گندگی کے باوجود، ایک معاشی پہلو رکھتا ہے۔ ہاں یہ رسکن، کارلائل یا ان کے ایسے دوسرے ناقدین کا یہ خیال صحیح نہیں کہ معاشی تحلیل کا دائرہ ان ہی سوالات تک محدود ہے۔ اگر یہ جماعت یعنی عیش پرستوں کی جماعت باقی نہ رہے، بلکہ سادھوؤں یا ولیوں کی جماعت بن جائے، اور اپنے پرانے پسندیدہ مشاغل کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تو بھی ان کا کردار معاشی تحلیل کے موضوع سے خارج نہیں ہوگا۔ انسانی کردار کو معاشیات نے جن تقسیموں میں بانٹ دیا ہے وہ اب بھی اس جماعت کے اعمال کا احاطہ کرلیں گی۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ اس جماعت کی مطلوب چیزیں اب بدل چکی ہوں گی، بعض چیزیں کمیاب ہوجائیں گی، بعض کی دستیابی کی مقدار میں مزید کمی ہوجائے گی۔ انگور کی بیلوں کی کاشت سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ کم ہوجائے گی، اس لیے ایسے باغوں کے لگان میں کمی آجائے گی، برخلاف اس کے گرجاؤں کے لیے سامان تعمیر کی طلب میں اضافہ ہوگا۔ عبادت اور دوسرے اچھے کاموں میں صرف کرنے کے لیے وقت کی تقسیم اب بھی ایک معاشی پہلو رکھے گی، بالکل اسی طرح جیسے ان کی پہلی حالت میں انھیں رنگ رلیوں اور آرام کے درمیان وقت کی تقسیم کرنی پڑتی ہوگی، ناز نے معاشیات کو "غلیظ فلسفہ" کا نام دیا تھا، لیکن فلسفہ معاشیات صرف ادنا اور گھٹیا درجہ کی چیزوں ہی سے دل چسپی نہیں لیتا، وہ تو زندگی کے ہر اہم پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔

لیکن انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ معاشیات کی وسعت سے متعلق اس قسم کی غلط فہمیوں کی ذمہ داری ایک حد تک خود ماہرینِ معاشیات پر ڈال دی جائے۔ جہاں تک ان کی عملی تحقیقات کا تعلق ہے انھوں نے اپنے موضوع کی وسعت میں کہیں کمی نہیں آنے دی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے موضوع کی تعریف میں غلطی کی ہے اور اسی وجہ سے یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور جب کہیں انھیں اس طرح کی تنقیص کا سامنا کرنا پڑا ہے تو وہ بالکل غیر ضروری طور پر نادم اور عذر خواہ دکھائی دیتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ عہد حاضر کے وہ ماہرینِ معاشیات جن کے نزدیک معاشیات کا تعلق "انسان کی نسبتاً مادی زندگی" سے ہے موضوع کی اہمیت سے واقفیت کے باوجود اس طرح کی تنقیص کے جواب میں یہ نکمّی بات کہنے کے عادی ہیں۔ کہ "روٹی توفن کاروں اور ولیوں دونوں ہی کی زندگی کے لیے ضروری ہے" اس طرح کی معذرت قطعی غیر ضروری ہے، اور ساتھ ہی اس سے ان لوگوں کے دماغ میں غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو مادّی زندگی کو ذرا حقیر سمجھتے ہیں، اگر کارلائل اور رسکن نے تھوڑی سی ذہنی محنت کرنے کی زحمت برداشت کی ہوتی تو وہ انسانی کردار کی تشریح و تفسیر کے لیئے اس مفید علم کی اہمیت سے انکار نہ کرتے نہ ان ذہین شخصیتوں کو اتنے نامنصفانہ طریقے پر بُرا بھلا کہتے جنھوں نے یہ مفید آلہ انھیں وراثت کے طور پر دیا تھا۔ ان کی تنقیدیں اس بات کی شاہد ہیں کہ انھوں نے معاشیات کی ماہیت سمجھنے کی کوشش نہیں کی، شاید وہ یہ محنت کرنا نہ چاہتے تھے۔ اس کے برخلاف جو لوگ اسے سمجھنے اور برتنے

کی کوششیں کر رہے تھے، ان کے اقوال اور ان کے خیالات کی غلط تفسیریں کرنا ان کے لئے کہیں آسان اور شاید زیادہ مرغوب مشغلہ تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ ایک ایسے علم کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنے کے مواقع بڑی آسانی سے مل جاتے تھے جو ابھی اپنے موضوع کی بنیادی ماہیت سے خود آگاہ نہ تھا۔

معاشیات کے بدنام کرنے والوں کو یہ کہنے کا کوئی جائز حق نہیں کہ معاشیات کا تعلق ادنا قسم کے مقاصد سے ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی معاشیات کے ماہرین کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ اپنی تشریح یا تفسیر کے لیے جو عنوانات چنیں انھیں بلند و برتر عنوان سمجھیں۔ معاشیات جنگ کے متعلق پروفیسر کینن کی متضاد رائے کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے لیکن عام طور پر ہم شاید یہ کہنے میں بھی حق بہ جانب ہوں گے کہ اس معاملہ میں پروفیسر کینن کا طرز عمل کچھ ایسا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید ان کا خیال یہ ہے کہ معاشیات جن مسائل کی تشریح یا تفسیر میں معاونت کر سکتی ہے، وہ مسائل انسان کے اہم ترین، اور انتہائی باعزت مسائل ہیں۔ سینٹ پیٹر کی طرح ان کا نعرہ ہے نہیں خدایا! میرے منہ کسی گھٹیا ناپاک چیز سے آلودہ نہیں ہوتے ہیں" مثلاً "دولت" کے ابتدائی باب میں وہ لکھتے ہیں۔ بیع و شریٰ کے معیار کی وجہ سے بہت سی ایسی باتیں معاشیات کے موضوع کا جزبن جاتی ہیں، جن سے ہم عام طور پر بحث نہیں کرتے اور نہ ان سے بحث کرنا کچھ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائے تاریخ سے ہی انسان کی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے خرید و فروخت کا ایک سلسلہ قائم ہے، لیکن اس خرید و فروخت

کو معاشیات کے موضوع کا جز کبھی نہیں سمجھا گیا، مذہب یا اخلاق کے اصولوں کے خلاف بعض کام کرنے کے لئے کلیسا نے اکثر بالکل علانیہ اور کبھی کبھی ذرا چوری چھپے خاص حقوق بیچے ہیں، جن کو خرید کر گناہ یا جرم وسزا کے اندیشہ کے بغیر کیا جا سکے۔ لیکن ان معافی ناموں کو بھی معاشی اشیا کا درجہ نہیں دیا گیا ہے۔" لیکن یہ رائے یقیناً بحث طلب ہے۔ معاشیات کا مطالعہ کرنے والا ایک طالب علم عام انسانوں کی طرح ایک فاحشہ عورت کے کام کو ناپاک یا گندا تصور کر سکتا ہے۔

لیکن معاشیات کم یاب ذرائع کے استعمال کے طریقوں سے بحث کرتی ہے اور یہ "چیز" معاشی نقطۂ نظر سے کم یاب ذرائع کی فہرست سے الگ نہیں کی جا سکتی، خریدی ہوئی محبت کا ایک معاشی پہلو ہے۔ اور اس سے انکار کرنا حقائق سے آنکھ بند کر لینے کے مرادف ہے اور کچھ نہیں، جہاں تک مراعت کی خرید و فروخت کا سوال ہے معاشی تاریخ شاہد ہے کہ یہ سودے بہت ہی مقبول رہے ہیں، کیا ان رعایتی حقوق کی خرید و فروخت تقسیم دولت، دوسری چیزوں کی خرید و فروخت اور پیداوار دولت کے نظام پر اثر انداز ہوتی تھی یا نہیں؟ کیا یہ ایک معاشی سوال نہیں؟ کم یابی ذرائع انسانی کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور ہمیں اس حقیقت کے نتائج تسلیم کرنے میں ہچکچانا نہ چاہیے کہ انسانی کردار جو قلت ذرائع سے اثر پذیر ہوتا اپنے اندر ایک معاشی پہلو رکھتا ہے۔

مسئلے کے اس پہلو کو نظر انداز کرنے سے بہت سی پیچیدگیوں

اور دقتوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایسی الجھنوں کی ایک دل چسپ مثال سرجوزایہ اسٹامپ کے ایک مقالے میں ملتی ہے جو انھوں نے "ایک معاشی عنصر کی حیثیت سے" کے عنوان سے سپرد قلم کیا تھا۔ سراسٹامپ دیہات کو قایم رکھنا چاہتے ہیں اور پرانی تاریخی عمارتوں کے بقا کے حامی ہیں، ساتھ ہی ان کا خیال ہے کہ معاشیات انسان کی مادی خوش حالی سے واسطہ رکھتی ہے، اور اس لیے اسٹرٹیفورڈ ہاؤس کے باقی رکھنے کے لیے انھیں یہ عجیب و غریب دلیل استعمال کرنی پڑتی ہے، "جمالیات کی طرف سے بے نیازی آخر کار معاشی پیداوار پر اثر انداز ہوگی، لیکن اگر ہم جمالیات پر دھیان دیتے رہیں تو معاشی خوش حالی میں اضافہ ہوگا۔ یعنی اگر ہم حسن کی مملکت ڈھونڈھیں تو ساری مادی خوش حالی ہمیں از خود بخش دی جائے گی۔ اور سراسٹامپ اپنی بلاشبہ عظیم المرتبت شخصیت کی تائید کے زور پر یہ چاہتے ہیں کہ "تاجر اور کاروباری لوگ اسے سچ بات سمجھ لیں۔

جس مقصد کی تائید کے لیے اس دلیل سے کام لیا جا رہا ہے اس سے تو ہمدردی ممکن ہے۔ لیکن یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ دلیل منطقی طور پر کچھ بہت وزنی ہے۔ جیسا کہ سراسٹامپ نے کہا ہے، ممکن ہے یہ صحیح ہو کہ پرانی عمارتوں کے دیکھنے۔ اور خوب صورت چیزوں سے لطف اندوز ہونے سے دل کو سکون اور دماغ میں سعت پیدا ہوتی ہے، اور اس نقطہ نظر سے وہ جماعت جہاں ان دونوں باتوں کے مواقع نسبتاً زیادہ ہوں گے، کچھ اور "مادی فائدے" بھی حاصل

کر سکتی ہے۔ لیکن یہ تو محض خوش فہمی ہے کہ اُسے لازمی سمجھا جائے نہ تو تجربہ اس کی شہادت دیتا ہے اور نہ یہ ایک واضح امکان ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ مادی آرام کو اگر ہم جمالیاتی یا اخلاقی قدروں پر قربان کر دیں تو لازماً اس کی مادی تلافی نہیں ہوتی، ایسا ہوتا ہے جب ہم مجبور ہوتے ہیں کہ روٹی پسند کریں یا سوسن کے پھول۔ ایک چیز منتخب کر کے۔ ہم دوسری چیز کھونے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ تو ممکن ہے کہ ہم اپنی پسند یا اپنے انتخاب پر مطمئن ہو جائیں۔ لیکن یہ خیال کہ اس میں انتخاب کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہی نہیں اور سوسن کے چننے سے جو روحانی یا دماغی سکون ملے گا۔ وہ مزید روٹی پیدا کر دے گا، محض خود فریبی ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ جمالیات کے پرستاروں پر خدا اتنا مہربان ہو جاتا ہے کہ ان پر آسمان سے مادی اشیا کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ معاشیات انسانی مقاصد کو ایک دوسرے سے اتنا ہم آہنگ نہیں سمجھتی۔ ہم مختلف چیزوں کو پسند کرتے ہیں مگر ان کی کم یابی ہمیں مجبور کر دیتی ہے کہ ہم بعض کے حصول کی تمنا سے ہی دل بہلائیں۔ معاشیات ہماری پسند کی کشمکش کو اچھی طرح نمایاں کر دیتی ہے، اور یہ بات واضح کرنے میں کہ ہمارے لاتعداد خواب منت کش تعبیر نہیں ہو سکتے، معاشیات ایک المیہ ڈرامے کا کام کرتی ہے۔

سر اسٹامپ معاشیات کی "مادی" تعریف کے حامی ہیں اسی وجہ سے انھیں غلط فہمی ہوئی اور وہ معاشیات اور جمالیات

کے بنیادی امتیاز کو نظر انداز کر بیٹھے۔

جمالیات کا تعلق ایک مخصوص قسم کے مقاصد سے ہے، خوبصورت اشیا کی تلاش اور ان سے محفوظ ہونے کی خواہش ایک مقصد ہے، لیکن اس مقصد کے حصول کی خواہش دوسرے مقاصد کے حصول کی خواہش سے ٹکراتی ہے اور نتیجۃً ایک یا دوسری خواہش زیادہ اہمیت کی حامل قرار پاتی ہے اور ہم اسے پورا کرنے کے لیئے اپنے مادی وسائل صرف کرتے ہیں، لیکن معاشیات کو نفس مقصد سے کوئی تعلق نہیں، اُسے تو صرف اس سے مطلب ہے کہ یہ مقاصد قلیل المقدار ذرائع کے استعمال پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے، ان کی اضافی اہمیت متعین کرنے کا کام معاشیات افراد پر ڈال دیتی ہے۔ اور صرف اس سوال کا جواب ڈھونڈھنے کی کوشش کرتی ہے کہ مقاصد کی ایک درجہ وار ترتیب کردار کے بعض پہلوؤں پر کس طرح اثر ڈالتی ہے۔

لیکن یہاں پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ روپے پیدا کرنے کو ایک مقصد قرار دے دیا جائے۔ تب ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ انسانی کردار کے بعض معاشی مقاصد ہوتے ہیں (روپے پیدا کرنا)، اور بعض "غیر معاشی"، اس حیثیت سے بڑے اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ معاشی تحلیل میں اس مفروضہ کا کیا حصہ ہے کہ انسانی کردار کا تنہا مقصد روپے پیدا کرنا ہے؟ اس سوال سے تو ہم آیندہ ایک باب میں تفصیلی بحث کریں گے۔ لیکن یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ دلیل زر کی اہمیت کے ایک غلط تصور پر مبنی ہے، روپے پیدا کرنا

خرید و فروخت کے درمیان کی ایک منزل ہی، اپنی محنت فروخت کر کے یا اپنی ملکیت کے استعمال کا حق بیچ کر رُپے پیدا کرنا، خود مقصد نہیں، بلکہ اور چیزیں خریدنے کا ذریعہ ہی، ہم اس رقم کو صرف اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ اس سے یا تو حال میں یا مستقبل میں کچھ چیزیں خریدنے کا کام لیں گے اور اس لئے رُپے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہی کہ ہم اس سے وہ مادی ذرائع حاصل کریں جن کی مدد سے ہم ان تمام خواہشات کو پورا کریں جو خریدی ہوئی چیزوں کے ذریعے پوری کی جاسکتی ہیں اور اس معنی میں ظاہر ہی، زر محض ایک ذریعہ ہی یعنی مبادلہ کا ایک وسیلہ یا حساب لگانے کا ایک معیار۔ اگر جماعتی زندگی کو ساکن فرض کرلیں، تو سوسائٹی کے لئے کچھ کم یا زیادہ روپوں کی تعداد کوئی اہمیت نہیں رکھتی افراد کے لئے یہ صرف اس حد تک اہم ہی کہ وہ مقاصد کی تکمیل پر اثر انداز ہوگی، صرف ایک بخیل انسان کو رُپوں کی لامحدود مقدار جمع کرنے سے خوشی ہوتی ہی اور ایک بخیل آدمی کی مثال کو ہم اس حد تک استثنا تصور کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے خیال میں سب جانتے ہیں۔

اخلاقیات یا جمالیات کے برخلاف معاشیات کو تعین مقصد سے کوئی تعلق نہیں، اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہی کہ معاشیات اور پیداوار دولت کے فنی مسائل میں بھی امتیاز قائم کردیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں بعض مدا

پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں اس لیئے آیئے ذرا اس سوال پر ایک تفصیلی نگاہ ڈال لیں۔

معاشیات اور صنعتی علوم کے مابین کیا تعلق ہے، یہ سوال اُن لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں کہ معاشیات کا تعلق انسان کی مادی خوش حالی کے اسباب سے ہے، بڑی الجھنوں کا باعث ہے، کیونکہ یہ بات صاف ہے کہ علوم صنعت کا تعلق مادی خوش حالی سے ہے لیکن معاشیات اور صنعتی علوم کے مابین امتیاز صرف یہی نہیں ہے کہ اُن میں سے ایک سائنس ہے اور دوسرا ایک فن بلکہ کچھ اور بھی فرق ہے۔

سائنس کی معلومات کا کافی بڑا ذخیرہ ایسا ہے جو پیداوار دولت کے فن کے لیے مفید ہے لیکن جس کو معاشیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آخر دونوں کے درمیان حدِ فاصل کیا ہو؟ سر ولیم بیورج نے اپنے ایک لکچر میں اس دقت کی طرف اشارہ کیا ہے "معاشیات کو انسانی خوش حالی کے مادی پہلو سے متعلق سمجھنا، اس موضوع کی ایک بہت ہی وسیع تعریف کرتا ہے، ایک گھر انسان کی مادی خوش حالی میں اضافہ کرتا ہے اور ظاہر ہے گھر ایک مادی چیز ہے، لیکن ایک گھر کے بناتے وقت یہ سوال کہ چھت کاغذ کی ہو یا پتھر کی ایک ایسا سوال ہے جسے معاشیات سے کوئی واسطہ نہیں، یہ تو گھر بنانے کے فن کی مدد سے ہی حل ہو سکتا ہے" ہم اس دقت کو یوں حل نہیں کر سکتے کہ معاشیات مادی خوش حالی کے "عام"

اسباب سے تعلق رکھتی ہے کیوں کہ معاشیات علوم صنعت کے ایک مجموعہ کا نام نہیں اور نہ ان کے مشترک پہلو کا۔ مثلاً حرکت کی سائنس کے مطالعہ سے ایسے کلیات ہاتھ آسکتے ہیں جو بہت سے کاموں کے لیے مفید ہوں، لیکن ان کو معاشیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور معاشی نفسیات کے بعض ماہرین جو چاہیں امید باندھیں، حرکت کی سائنس معاشیات کی جگہ بھی نہیں لے سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم معاشیات کی کسی ایسی تعریف کے چکّر میں پھنسے رہیں گے جو معاشیات کا موضوع انسان کی مادی خوش حالی کے اسباب کو سمجھے معاشیات اور پیداوار دولت کے فن کا باہمی تعلق بڑی طرح غیر واضح رہے گا۔

لیکن ہماری اختیار کردہ تعریف کی روشنی میں یہ تعلق بالکل واضح ہے، پیداوار کا فن مختلف معاشی اشیا کی اضافی قلت پر اثر انداز ہوتا ہے، سوتی کپڑے بنانے کا فنی نقشہ معاشیات کا جز نہیں، لیکن ایک مخصوص طریقہ جس کی مدد سے کپڑوں کی ایک خاص مقدار پیدا کی جاسکتی ہے۔ بعض دوسرے اثرات کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی رسد کی تعداد پر اثر ڈالے گا اور کپڑوں کی مقدار رسد پر اس کی قیمتوں کا انحصار ہوگا، ان قیمتوں کا انسانی کردار پر اثر پڑے گا۔ بعض لوگ اس قیمت پر کم کپڑے خرید سکیں گے۔ بعض زیادہ، بعض کو کپڑوں کے لیے اپنی ضرورت سے کم پر اکتفا کرنا پڑے گا، اور معاشیات انہی مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔

لیکن یہاں بعض غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ انھیں رفع کر دیا جائے۔ یہاں ممکن ہے کہ یہ سوال پیدا ہو کہ کیا فن پیداوار کو اپنی بحثوں کا نقطۂ آغاز تصور کر کے کیا ہم معاشیات کے موضوع سے وہی مسائل خارج نہیں کر دیتے جن کے حل کرنے میں معاشیات کی افادیت سب سے زیادہ ہے؟ کیا پیداوار کا تعلق صنعت سے نہیں، اور کیا نظریہ پیداوار دولت معاشیات کے مرکزی مسائل میں سے ایک نہیں؟

یہ اعتراض بہ ظاہر بہت وزنی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی بنیاد ایک غلط فہمی پر ہے، جسے دور کرنا بہت ضروری ہے، پیداوار کے فنی مسائل کے متعلق ہم نے جو رویہ اختیار کیا ہے، اس سے پیداوار کے ایک معاشی نظریہ کی ضرورت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ اشیا کی پیداوار پر صرف فنی اثرات ہی کا اثر نہیں پڑتا، اس میں شک نہیں کہ فن پیداوار ایک بہت ہی اہم جزو ہے، لیکن بس فن ہی سب کچھ نہیں۔ معاشیات کی موجودہ طرز تحلیل کی یہ ایک بڑی خوبی ہے کہ اس کی مدد سے ہم فن پیداوار کی مناسب اہمیت تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت ضروری ہے، یہ کہنا شاید کوئی مبالغہ نہیں کہ آج تہذیب و تمدن کو ایک بڑا خطرہ اس سے ہے کہ جن دماغوں نے علوم طبیعی کی تربیت پائی ہے وہ معاشی، اور فنی مسائل میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتے۔

فرض کیجیے ایک اکیلے آدمی کے پاس ایک ہی کم یاب

چیز ہے، اسے وہ کیوں کر استعمال کرے گا؟ فرض کیجئے کروسو کے پاس ایک مخصوص لمبائی چوڑائی کی تھوڑی سی لکڑی ہے اور یہ مقدار کروسو کی ساری ضروریات کے لیے کافی نہیں اور بر وقت اس سے زیادہ لکڑی کا حصول ممکن نہیں۔ اب اس لکڑی کے استعمال کا طریقہ طے کرنے میں کروسو کے فیصلے پر کیا چیزیں اثر انداز ہوں گی؟ اگر یہ لکڑی صرف ایک ہی وقت میں خرچ کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے استعمال کا مقصد بھی صرف ایک ہی ہے اور اگر اس کے استعمال کرنے کے لیے کروسو کے پاس کافی وقت بھی ہے تو ایسی صورت میں اس کے استعمال کا دارو مدار اس پر ہوگا کہ کروسو بنانے کے کون سے طریقے جانتا ہے۔ فرض کیجئے وہ اس لکڑی سے صرف آگ بنانا چاہتا ہے جو ایک کمرہ کو گرم رکھ سکے تو ایسی صورت میں آگ بنانے کا ڈھنگ ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ لکڑی کو کس طرح استعمال کیا جائے اور یہ ایک فنی سوال ہوگا۔

لیکن اگر اسے لکڑی ایک سے زیادہ مقاصد کے لیئے درکار ہے تو اس کے سامنے ایک اور سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ کتنی لکڑی آگ جلانے کے کام میں لائے اور کتنی ایک میز بنانے کے لیے، اب بھی میز اور آگ بنانے کے ڈھنگ کا معلوم ہونا ایک ضروری چیز ہے، لیکن اب لکڑی کے استعمال کا سوال صرف ایک فنی سوال نہیں رہ جاتا۔ ہماری سوسائٹی کے پاس کچھ مادی ذرائع ہیں، ان کو استعمال کرنے کے کچھ ڈھنگ ہمیں معلوم ہیں ان مادی ذرائع کی مدد سے ہم کچھ چیزیں پیدا کر رہے ہیں،

لیکن ان کے استعمال کے طریقے بدل کر کچھ اور پیدا کر سکتے ہیں
اس ماحول میں اور ان امکانات کی موجودگی میں ہماری سوسائٹی
کے مختلف افراد کی مختلف خواہشیں ہوتی ہیں، وہ سب
کی سب پوری نہیں ہوسکتیں، ہم میں سے ہر ایک کو
بعض چیزوں میں انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ معاشیات کا تعلق
انسانی کردار کے صرف اسی پہلو سے ہے۔ صنعت کے فنی
مسائل الگ ہیں، پروفیسر تیبر نے اس نکتہ کو بہت خوب صورتی
سے بیان کیا ہے۔ فنی سوال وہاں پیدا ہوتا ہے، جہاں مقصد
ایک ہو اور ذرائع بہت سے ہوں اور معاشی سوال جب
مقصد اور ذرائع حصول مقصد دونوں ہی ایک سے زیادہ
ہوں۔

ہماری دنیوی زندگی کی یہ ایک خاصیت ہے کہ ہماری خواہشیں
تو لامحدود ہیں لیکن وہ قلیل المقدار ذرائع جو ہمارے پاس
ہیں مختلف کاموں میں لگائے جا سکتے ہیں۔ یہ صرف کم یاب
پیداوار کے متعلق صحیح نہیں، بلکہ خود عاملین پیداوار اس کے
تحت آجاتے ہیں، مختلف قدرتی ذرائع اور محنت دونوں ہی
لامحدود قسم کے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیے جا سکتے
ہیں، اور اگر حال میں ہم آمدنی کے استعمال سے دست بردار
ہو جائیں اور اسے لیں انداز کر لیں تو یہ مستقبل میں کتنے ہی
قسم کے پرپیچ طریقۂ پیداوار کی بنیاد بنائی جا سکتی ہے، اور اسی لیے
کسی چیز کے بنانے کا ڈھنگ ہی کافی نہیں، ہم صرف اِس

معلومات کی بنا پر یہ طے نہیں کر سکتے کہ کیا کیا چیزیں ہماری قوم ... پیدا کر سکتی ہے، کیا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی جاننا پڑے گا۔ کہ دولت پیدا کرنے والا، اور اسے صرف کرنے والے کن چیزوں کے پیدا کرنے کے لئے تیار اور خواہش مند ہیں۔ لوگوں کی خواہشات اور ہماری پیداوار دولت کے امکانات اور صلاحیتیں، یہ دونوں مل کر انسانی کردار کے اس پہلو کا تعین کرتے ہیں جو معاشیات کا موضوع ہے، خواہشات کی تکمیل کا دارومدار صرف فنی معلومات پر شاید ایک ایسی سوسائٹی میں ہی ہو سکے گا۔ جہاں ہر چیز کی بہتات ہو، لیکن ایسی افراد کی دنیا میں پھر کوئی معاشی مسئلہ بھی باقی نہیں رہ جائے گا۔

یہ باتیں ہم سب جانتے ہیں، لیکن یہاں ان کے دہرانے سے صرف یہ مقصد ہے کہ وہ بنیادی مسائل زیادہ واضح ہو جائیں جن سے ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں، کبھی اگر ہم اس سوال کا جواب ڈھونڈھیں کہ ہماری سوسائٹی میں گراموفون کیوں بنتے ہیں تو اس کا جواب صرف یہ کافی نہیں ہوگا۔ کہ گراموفون اس لیے بنتے ہیں کہ ہم انھیں بنانا جانتے ہیں، ہم گیہوں پیدا کرنا بھی تو جانتے ہیں پھر اور گیہوں ہی کیوں پیدا نہیں کرتے وہ محنت اور سرمایہ جو گراموفون کے بنانے میں کام آتا ہے کیوں مزید گیہوں کی کاشت میں نہیں لگایا جاتا؟ اس سوال کا جواب یہ ہوگا۔ کہ گراموفون بنانا ایک نفع بخش کام ہے،

اس کے بنانے والے مالی فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ مزید گیہوں پیدا کرکے ایک نفع بخش قیمت حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ہمارا جواب اب قیمتوں اور اخراجات پیداوار کی مدد چاہتا ہے اور یہ افراد کی پسند اور ناپسند، رضامندی یا نارضامندی کا معاملہ ہے۔ ہم بہت سی ایسی چیزیں جانتے ہیں جن کے بنانے کا ڈھنگ ہماری سوسائٹی کو معلوم ہے، لیکن وہ پھر بھی بنائی نہیں جاتیں، کیوں؟ شاید اس لئے کہ ان کو پیدا کرکے جو قیمت وصول کرنے کا امکان ہے وہ اس لاگت کے پیش نظر جو اس کے بنانے میں آئے گی نفع بخش نہیں، لیکن لاگت زیادہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ بنانے کا ڈھنگ ابھی کافی ترقی یافتہ نہیں؟ ممکن ہے ایسا ہو لیکن یہ اس سوال کا کافی جواب نہیں جیسا کچھ بھی ڈھنگ ہمیں معلوم ہے اس کے مطابق جو لاگت آئے گی اتنی قیمت دینے کے لیے، لوگ کیوں تیار نہیں، اس سوال کا جواب صرف معاشیات کی مدد سے دیا جا سکتا ہے، کسی چیز کے بنانے میں لاگت کیا آتی ہے؟ اس کا دار و مدار اس پر ہے کہ مختلف عوامل پیداوار کے لیے ہمیں کیا قیمت دینی پڑتی ہے، اور اس کا دار و مدار کہ یہ چیز بنائی جائے گی یا نہیں اس پر ہے کہ آیا اس چیز کے لیے ایسی قیمت وصول کی جا سکے گی، جو لاگت سے زیادہ ہو یا نہیں، پہلی صورت میں یہ چیز بنائی جائے گی، دوسری صورت میں نہیں، عوامل پیداوار کے لیے کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے؟ ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں باہمی مقابلہ

عام ہو اس قیمت کا دار و مدار اس پر ہے کہ ان عوامل کی مدد سے جو مختلف چیزیں بنائی جا سکتی ہیں وہ سوسائٹی کے نزدیک کیا اہمیت رکھتی ہیں، اگر عوامل پیداوار کے لیے بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان عوامل کو کچھ دوسری ایسی چیزیں بنانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جنھیں سوسائٹی زیادہ اہم سمجھتی ہے۔ اگر عوامل پیداوار پر کسی کا اجارہ ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے مالک گراں معاوضہ طلب کریں اور کچھ عوامل عارضی طور پر بیکار رکھے جائیں، لیکن چاہے جو کچھ بھی ہو اس سوال کا جواب کہ ایک متعین وقت میں سوسائٹی میں کیا چیزیں بنیں گی وہاں شروع ہوتا ہے جہاں فنی مسائل کی مدد ختم ہو جاتی ہے۔

معاشیات کے طالب علم کو فی نفسہ علم صنعت سے کوئی سروکار نہیں، ہمیں مسئلہ کے اس پہلو سے صرف اتنا تعلق ہے کہ علم صنعت اشیا کی رسد کی بہتات یا قلت کا ایک سبب ہے، فنی معلومات کا اظہار سوسائٹی کی صلاحیت پیداوار دولت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اسی طرح جیسے لوگوں کی پسند اور مذاق کے اظہار کا ذریعہ، افراد کی درجہ واری ترتیب مقاصد ہے، لیکن دونوں کا تعلق بس یہیں ختم ہو جاتا ہے، معاشیات کو قلیل المقدار اشیا کے استعمال سے واسطہ ہے، لیکن علم صنعت کو اشیا یا اشخاص کی ذات سے ہے۔

کسی ملک کی صنعتی معلومات اور معاشرت دونوں ہی

اس معاشرت کے افراد کے حصول مقاصد پر بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں
حصول مقصد کی کوششیں جداگانہ شکلیں اختیار کرتی ہیں، مقصد
اور منہاج کے باہمی تعلق کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، معاشیات
کا موضوع بحث یہی "تعلقات" ہیں، معاشیات فی نفسہ مقاصد
سے بحث نہیں کرتی، نہ صنعتی معلومات یا معاشرت ہی معاشی
بحثوں کے عنوانات ہیں، ان سے حصول مقاصد کی کوششیں کس
طرح اثر پذیر ہوتی ہیں؟ یہی سوال معاشیات کا موضوع ہے، اگر
ہم اس رائے کو صحیح تسلیم کر لیں تو معاشی تاریخ اور "بیانی
معاشیات" کی ماہیت قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

نظری معاشیات کی ماہیت تو واضح ہے نظری معاشیات
ان تمام افعال سے بحث کرتی ہے جو مقاصد کے حصول کے لیے
قلیل المقدار ذرائع پیداوار کے استعمال کرنے کے سلسلے میں واقع
ہوں۔ معاشی تاریخ کا موضوع ہے انھی تعلقات کی تاریخ، معاشی
تاریخ "کمیابی" کے اظہار کے مطالعہ کی تاریخ ہے اور نظری معاشیات یہ
بتانے کی کوشش کرتی ہے کہ کسی چیز کی کمیابی کی شکل میں افراد کے
طرز عمل کی کیا نوعیت ہوتی ہے، معاشی تاریخ سے ہمیں یہ پتا لگتا ہے
کہ کس طرح ماضی میں فلاں چیز کی قلت کی بنا پر لوگ اسے کم
استعمال کرتے تھے، اور فلاں چیز کی بہتات تھی، اور اس لیے لوگ
بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔

معاشی تاریخ کے نقطۂ نظر سے بھی ہم واقعات کو حصوں میں
تقسیم کر کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں یہ حصہ تو ہمارے موضوع بحث

میں شامل ہے اور یہ نہیں ہے معاشی تاریخ کی حدود، نظری معاشیات کی وسعت کی طرح بعض واقعات کی صرف محدود قسموں پر نہیں کی جاسکتیں کہ اس سے ان کے بنیادی مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن تاریخ دوسری اقسام کی طرح معاشی تاریخ بھی انسانی زندگی کے کل مسائل کی مفصل توضیح سے واسطہ نہیں رکھتی، اس کی ساری توجہ واقعات کے ایک خاص پہلو پر مرکوز ہوتی ہے۔ معاشی تعلقات کی بدلتی ہوئی شکلیں، مختلف اشیاء کی طلب اور رسد کے حالات میں تبدیلی کا قیمتوں پر اثر، یہ اور اسی طرح کے سوالات معاشی تاریخ کا موضوع ہیں۔ جس طرح کل انسان علم معاشیات کا موضوع بن سکتا ہے، ٹھیک اسی طرح زندگی کی رنگارنگی میں واقعات کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو معاشی مورخ کی تحقیق کے لیے کارآمد نہ ہو۔

مثال کے طور پر یورپ کی اصلاح مذہبی کے ایک واقعہ کو لے لیجیے۔ مذہب کی تاریخ کے ایک طالب علم کے لیئے اس کی اہمیت کا راز مذہبی اصولوں اور مذہبی تنظیم پر اس کے اثرات میں مضمر ہے۔

فلسفۂ سیاسیات کے مورخ کی دل چسپی کا موضوع سیاسی تنظیم پر اس اصلاح کے اثرات، رعایا اور بادشاہ کے درمیان نئے تعلقات قومی ریاستوں کا عروج وغیرہ عنوانات ہوں گے۔

مختلف فنون لطیفہ کے موضوع اور اظہار کی شکلوں پر اس تحریک کا کیا اثر پڑا۔ اور موجودہ علمی تحقیق کے جذبہ کا ارتقا،

ثقافت کے ایک مورخ کے لیے یہ مسائل اہمیت رکھتے ہیں، لیکن ایک معاشی مورخ کے لیے اس تحریک میں دل چسپی کی بڑی چیزیں یہ ہیں کہ اس تحریک سے تقسیم دولت پر گہرا اثر پڑا۔ تجارت کے نئے راستے دریافت ہوئے۔ مراعات کی طلب میں تبدیلیاں ہوئیں معاشی مورخ کو اس سے مطلب نہیں کہ خود ذرائع اور مقاصد میں کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں، بلکہ اس سے کہ یہ تبدیلیاں معاشی تعلقات پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں، اگر اس تحریک کی بدولت فنون لطیفہ کی ایک خاص قسم کی مانگ بڑھ گئی، تو مذاق کی یہ تبدیلی معاشیات کے لیے دل چسپی کا باعث نہیں، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ کیوں ہوئی اور یہ اچھی ہے یا بُری ــــ ہماری تحقیق کا موضوع تو وہ مسائل ہیں جو اس کے بعد پیدا ہوتے ہیں، اس پسند کی تبدیلی سے دولت کی تقسیم پر کیا اثر پڑا، تقسیم کار میں کیا تبدیلیاں ہوئیں وغیرہ

اسی طرح دخانی مشینیں یا ریلوں کی ایجاد کے واقعے کو لے لیجیے اس سے پیداوار کے طریقوں میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں، مقاصد کی تبدیلی کی طرح ذرائع کی یہ تبدیلیاں بھی اپنے اندر دل چسپی کے بے شمار پہلو رکھتی ہیں، مثلاً خود فن صنعت پر ان کا کیا اثر پڑا، باخود صنعتوں میں ان ایجادوں کا کیا درجہ ہے، اس سے لوگوں کے طرزِ عمل پر کیا اثر پڑا، مختلف فنون نے ان سے کیا اثر قبول کیا اور اس طرح کے بے شمار مسائل ایک طرح خارج از بحث ہیں ان ایجادات سے طلب و رسد اشیاء پر کیا اثرات پڑے۔ تقسیم دولت کا نظام کیوں کر بدلا، صنعت کی تنظیم کس طرح اثر پذیر ہوئی۔ غرض معاشی

تعلقات کس طرح متاثر ہوئے معاشیات کو بس ان سے واسطہ ہے، ابتدائی ریلوے انجنوں کی شکل کیسی بھی تھی معاشیات کے مورخ کو اس سے کوئی علاقہ نہیں، لیکن اس تیز رفتاری سے دُور دُور مقامات پر اشیا کی رسد، اور بعض ذرائع پیداوار کی مانگ پر اثر پڑا، کیوں کہ ان ایجادات کے استعمال سے قوموں کی آمدنیاں اور اشیا کی قیمتیں بھی بدلیں، اور اس حیثیت سے یہ تبدیلیاں بھی معاشی مورخ کی دل چسپی کا مرکز ہیں۔

اسی طرح بیانی معاشیات (جسے زمانہ موجودہ کی معاشی تاریخ بھی کہ سکتے ہیں) کا موضوع قلت ذرائع کے پیدا کردہ معاشی تعلقات کی تشریح و توضیح ہے، اگرچہ اس مقصد کے حصول کے لیے بسا اوقات بہت ہی خصوصی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً زر کے پیدا کردہ مسائل کے مطالعے کے دوران میں اکثر ہمیں ایسے مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے جو بے حد فنی یا قانونی ہوتے ہیں —— مثلاً ہُنڈی کے ذریعے لین دین کا طریقہ، زر کاغذی کے اجرا کے قوانین وغیرہ، ایک بینکر یا وکیل کے لیے یہی مسائل اس کی ساری توجہ کا مرکز ہوتے ہیں، لیکن ایک معاشیات کے طالب علم کے لیے یہ معلومات مفید تو ہوتی ہیں، مگر در اصل اُسے ان مسائل کے مطالعے سے اپنے اصل مقصد میں مدد حاصل کرنا ہوتا ہے، اس کا اصل مطمحِ نظر تو یہ پتہ لگانا ہوتا ہے کہ بعض خاص حالات میں زر کی رسد کی مقدار میں تبدیلی کے کیا نتائج ہوں گے۔ فنی اور قانونی مسائل اس کی دل چسپی کا باعث اسی وقت تک ہیں جب تک

وہ اس کو اس مسئلے کے حل کرنے میں مدد دیں۔

آئیے آخر میں یہ بھی دیکھ لیں کہ ان تمام بحث کا مارکس کے مشہور نظریے "مادی تعبیر تاریخ" پر کیا اثر پڑتا ہے، ہمارے نقطہ نگاہ کے مطابق بعض امتیازات جنھیں عام طور پر نگاہ میں نہیں رکھا جاتا، ضروری ہیں

جیساکہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، ماضی میں معاشیات کی ایک ایسی تعریف تو ضرور کی گئی ہے جسے "مادی" کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کا موضوع قطعاً "مادی" نہیں ہے، اور تعریف کی جس تبدیلی کی ہم نے حمایت کی ہے، وہ موضوع کی تبدیلی کے بجائے موضوع کی وضاحت اور وسعت کا واضح تعین کرنے میں معاونت کرتی ہے، معاشیات کی "مادیت" نام نہاد مادیت تھی، ورنہ حقیقتاً معاشیات قطعاً مادی نہیں۔

یہ گمان ہو سکتا ہے کہ تاریخ کی "مادی تعبیر" بھی شاید اسی طرح ایک غلط تعریف کا شکار ہو۔ اور محض نام کی تبدیلی اس تصور کو موجودہ معاشی تحلیل کے اصولوں سے ہم آہنگ بنا دے، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں، کیونکہ تاریخ کی معاشی تعبیر صرف نام کو ہی مادی نہیں، بلکہ اس کا موضوع بحث بھی صحیح معنی میں "مادی" ہے۔ اس نظریے کے مطابق تاریخ کے تمام واقعات، یا کم از کم اہم واقعات "مادی" تبدیلیوں کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ تاریخ کے واقعات ایک مادی دنیا کی حدود میں جنم لیتے ہیں، لیکن مارکس نے لفظ "مادی" اس فلسفیانہ معنی میں استعمال

نہیں کیا تھا، نہ اس کا مطلب یہ تھا کہ نفسیاتی رجحانات کا دارومدار دراصل انہی پر ہوتا ہے۔

مارکس خود شاید ان معانی کو تسلیم کر لیتا —— لیکن اس کا اصل نظریہ تو یہ تھا کہ پیداوار کے مادی ذرائع کی تبدیلیاں سارے جماعتی اداروں کی ساخت کا باعث ہوتی ہیں اور جماعتی اداروں کی ساری تبدیلیاں پیداوار کے فن کی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں، اس کے نزدیک تاریخ فنی تبدیلیوں کا محض ایک عکس اور انسانیت کی تاریخ مختلف اوزاروں کی تاریخ کا مجموعہ ہے۔

یہ تصور صحیح ہو یا غلط اس سے ہمیں بحث نہیں، لیکن یہ تو بالکل صاف ہے کہ یہ تصور ایک مادی تصور ہے، معاشیات کے اصولوں سے اس کا استنباط نہیں ہوا ہے۔ اس تصور کا منشا صرف یہی نہیں ہے کہ فنی تبدیلیاں قلت کے پیدا کردہ تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہیں، اگر صرف اتنا ہوتا تو یہ عہد حاضر کے معاشی تصورات سے ہم آہنگ ہوتا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ نظریہ نہایت ہی قطعیت کے ساتھ اس خیال کی حمایت کرتا ہے کہ انسانی تعلقات میں ساری تبدیلیاں فنی تبدیلیوں کے باعث ہوتی ہیں، اور یہ ایک عمرانی تصور ہے، جو معاشی کلیات کے محدود میدان سے ماورا ہے۔

اس نظریے کی مراد یہ ہے کہ مقاصد اور اشیاء کی اضافی اہمیت میں ساری تبدیلیاں فنی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں، یعنی اساسی قدریں فنی حالات کی پیدا کردہ ہوتی ہیں، اگر ان فنی حالات میں تبدیلی

ہوتی ہے تو مذاق میں تبدیلیاں ہوں گی ورنہ نہیں، اشیا کی طلب میں کوئی تبدیلی بغیر نئی تبدیلیوں کے ممکن ہی نہیں اور "قلت" کا کوئی "نفسیاتی" (یا "جسمانی") پہلو ہے ہی نہیں، انسانوں کی ذہنی ساخت کیسی بھی ہو، ایک فنی ماحول میں ایک ہی سا مذاق اور ایک ہی سے ادارے پیدا ہونا ناگزیر ہے، یہ سب کچھ صحیح ہو یا غلط، ہیگل کے خیالات سے ماخوذ بکواس ہو یا اشیا کی ماہیت کا بہت ہی گہرا مطالعہ یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ نظری معاشیات کے قوانین یا کلیات سے اس تصور کا استنباط ممکن نہیں، انسانی افعال کے محرکات کے متعلق یہ ایک کلیہ قاعدہ ہے، جس کی معاشیات کے نقطہ نظر سے قطعاً ضرورت نہیں، اس تصور کے لیے "مادی" کی صفت تو صحیح ہے، لیکن یہ "معاشی" تصور نہیں، معاشیات سے تاریخ کی تعبیر اور تشریح میں ممکن ہے بہت سی مدد مل سکے، لیکن معاشی تحلیل میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس کی بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ساری تاریخ "معاشی" اسباب کی مدد سے حل کی جا سکتی ہے خصوصاً اگر "معاشی" سے مراد مادی فنی تبدیلیاں ہوں، تاریخ کی مادی تعبیر کو معاشی تعبیر کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس وقت یہ غلط خیال رائج تھا کہ معاشیات کا موضوع بحث "مادی اسباب مسرت" ہے۔ مگر در اصل ایسا نہیں اس لیے معاشات کی مادی تعبیر کو اپنے قدموں پر ہی کھڑا ہونا پڑے گا، معاشیات اس کے تصورات کو کوئی سہارا نہیں دے سکتی، نہ اپنی وسیع تحقیقات کے دوران میں کہیں بھی وہ ان تعلقات کو صحیح تسلیم کرتی ہے جو اس

تصور کے بنیادی نظریے کی حیثیت رکھتے ہیں، معاشیات کے نقطۂ نظر سے افراد کے نزدیک مختلف اشیا کی اہمیت میں تبدیلی مقدمہ (Data) کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۳)

معاشی قدروں کی اضافیّت

متعین مقاصد کے حصول کے لیے متعین ذرائع کی قلّت انسان کے کردار پر ایک اثر ڈالتی ہے، معاشیات کا موضوع انسانی کردار کا یہی پہلو ہے، اسی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اشیا کی قلت کا تصور کوئی مطلق تصور نہیں ہے، قلت محض کم یابی کا نام نہیں، طلب اور قلّت کا گہرا تعلق ہے، بغیر طلب کے قلت کا تصور وجود میں ہی نہیں آتا، اچھے انڈے کم یاب ہیں اس لیے کہ لوگ جتنی تعداد چاہتے ہیں، اتنی تعداد موجود نہیں۔ لیکن خراب انڈے، خدا کرے ان کی تعداد اور بھی کم ہو، معاشیات کی اصطلاح میں کم یاب نہیں سمجھے جائیں گے۔ قلت کے اس تصور کی بڑی نظری اور عملی اہمیت ہے، اور اس باب میں اِسی اہمیت کی تشریح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۲۔ اوپر کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ معاشی اشیا کا تصوّر صوری ہے نہ کہ مادی۔ اگر انسان کو کسی مخصوص چیز سے کوئی واسطہ نہ ہو تو اس

چیز کو کوئی بھی ذاتی خصوصیت ایک "معاشی" نہیں بنا سکتی۔ خدمات کو بھی اسی طرح اگر متعین مقاصد کی تکمیل سے الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ بھی معاشی تحقیق و جستجو کا موضوع باقی نہیں رہتیں۔ کوئی چیز یا خدمت معاشی اہمیت رکھتی ہے یا نہیں اس کا دار و مدار تمام تر اس پر ہے کہ افراد کے نزدیک ان کی طلب کو کوئی اہمیت حاصل ہے یا نہیں۔

جن چیزوں کی ملکیت کو ہم دولت کی ملکیت کا مرادف سمجھتے ہیں وہ دولت کے تصور میں اس لیے شامل نہیں کہ ان میں کچھ متعین مادی خصوصیات ایسی ہیں بلکہ وہ دولت کا جز صرف اس لیے ہیں کہ وہ قلیل المقدار ہیں، غذا کے بیان کے لیے ہم وٹامن کی مقدار کو کام میں لا سکتے ہیں، یا اس کے مادے سے مدد لے سکتے ہیں لیکن دولت کے تصور کو ہم اس طرح بیان نہیں کر سکتے کہ اس میں فلاں فطری خصوصیات پائی جاتی ہیں، دولت کا تصور ایک اضافی تصور ہے، سادھوؤں کے ایک گروہ کے لیے دنیا میں بعض قسم کی اشیا کی اتنی بہتات ہو سکتی کہ وہ چیزیں ان کے لیے مفت اشیا ہوں اور اس لیے ان کے نزدیک دولت میں شمار نہیں ہوں گی، لیکن کچھ عیش پرستوں کو انھی حالات میں رکھ دیا جائے تو وہ اپنے کو بالکل فقیر تصور کریں گے۔ ان کے لیے وہی اشیا معاشی اشیا (اور اس لیے دولت کا جز) ہو سکتی ہیں۔

اسی طرح قوت پیداوار کا تصور ہے، اس سے ہماری منشا ہوتی ہے طلب کو پورا کرنے کی قوت، نہ یہ کہ کچھ چیزوں کی پیداوار اگر طلب میں تبدیلی ہو جائے تو قوت پیدا بھی بدلنا چاہیے، ورنہ

ہو سکیں گی۔ پھر معاشیات کے نقطۂ نظر سے ضروریات پوری نہ ہو سکیں گی۔

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ کو ۱۱ بجے دن میں وزارت حرب کو جس قسم کے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ ہمارے مطلب کی وضاحت کے لئے ایک بڑی اچھی مثال ہے۔ سالہا سال کی کوشش کے بعد انگلستان نے زیادہ سے زیادہ مقدار میں جنگی سامان پیدا کرنے کی قوت حاصل کر لی تھی پیداوار کے مختلف پروگرام تکمیل کی مختلف منزلوں تک پہنچ چکے تھے، اچانک ساری صورت حال بدل گئی، ان چیزوں کے لیے کوئی مزید" طلب" باقی نہیں رہی کیوں کہ جنگ کی ضرورتیں ختم ہو چکی تھیں، ان کو اب کیا کیا جائے، مسٹر چرچل لکھتے ہیں کہ تبدیلی کو آسان کرنے کے لیے یہ طے کیا گیا کہ جو چیزیں ۶۰ فی صدی سے زیادہ مکمل ہو چکی ہوں انھیں مکمل کر دیا جائے" اس طرح جنگ کے بعد ہفتوں تک ہم مختلف قسم کا جنگی سامان پیدا کرتے رہے یہ فضول خرچی تھی لیکن غالباً غافلانہ نہ "

یہ آخری دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ اس سے ہمیں اس وقت بحث کرنے کی ضرورت نہیں، بتانا یہ ہے کہ ۔ اا بج کر ۵ منٹ پر جو چیزیں دولت کے تصور میں شامل تھیں، جن کا بنا سکنا یا نہ بنا سکنا اس وقت قوت پیداوار کے لیے معیار تھا، وہی چیز اا بج چکنے پر فضول ہو چکی تھیں ان کی مادی خصوصیات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، بندوقیں ویسی ہی تھیں، مشینیں بندوقیں بنانے پر اب بھی ویسی ہی قدرت رکھتی تھیں لیکن معاشی نقطہ نظر سے ہر چیز بدل چکی تھی، بندوقیں، بارود سب کی اہمیت فنا ہو چکی تھی، مقاصد بدل چکے تھے اور ذرائع

کی قلت کی نوعیت بھی ساتھ ہی ساتھ بدل چکی تھی۔

۳۔ معاشی مقادیر کی اضافیت کے جس تصور سے ہم ابھی بحث کر رہے تھے وہ عملی معاشیات کے بہت سے مسائل کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اصل موضوع کو تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ کر اس تصور کا زرا اور غور سے مطالعہ کرتے چلیں، نظریات سے کس طرح عملی زندگی کے مسائل کے سمجھنے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے، اس سے اچھی کوئی مثال اس کی وضاحت کے لیے شاید نہ مل سکے گی۔

کثیر مقدار میں اشیا کے پیدا کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس مسئلہ پر آج کل جو بحثیں ہوتی ہیں وہ ایک ایسے سوال کا پتا دیتی ہیں جو بغیر اس تصور کی مدد کے تشفی بخش طریقہ پر حل نہیں کیا جا سکتا، عوام کثیر مقدار کے فوائد سے مرعوب سے ہو چکے ہیں، دنیا یہ سمجھنے لگی ہے۔ کہ اس کی مصیبتوں کا حل اس میں ہے کہ ہر چیز فورڈ کے موٹر کے کارخانوں کی طرح بہت بڑے پیمانے پر بنانے لگے اور جو شخص "ڈی رائٹ" کے کارخانوں کی ساخت سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو، ایک لائق ماہر معاشیات سمجھ لیا جاتا ہے۔

موجودہ صنعتی پیداوار کی صلاحیت ہمارے تمدن کے لیے ایک بیش بہا نعمت ہے، اور اس کی اہمیت سے انکار، کسی سمجھدار آدمی کے لیے ممکن نہیں، وہ فنی تبدیلیاں جن کی مدد سے موٹر کار گراموفون یا اس طرح کی اور دوسری چیزیں پیدا کی جا سکیں اور

عوام تک پہنچائی جا سکیں یقیناً بہت عظیم الشان تبدیلیاں ہیں.
لیکن متعین مقاصد کے حصول کے لیے ان کی کیا اہمیت ہے، اس
کے لیے بہت ضروری ہے کہ مادی اشیا کی مقدار میں مجرد اضافہ، اور
طلب کی تکمیل اس معنی میں جو اس باب میں پیش کیا گیا ہے، ان دو
مختلف پہلوؤں کو نظر میں رکھا جائے۔ اور فنی نقطۂ نظر سے پیداوار
کی صلاحیت، اور عوام کی تسکین طلب کی خاطر پیداوار دونوں جداگانہ
تصور ہیں اور ان میں باہم امتیاز قائم رکھنا ضروری ہے، طلب کے
ہونے نہ ہونے سے قطع نظر کر کے، بعض چیزوں کو کثیر مقدار میں پیدا
کرنا خواہ وہ فنی نقطۂ نظر سے کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو لازماً معاشی حیثیت
سے مفید نہ ہوگا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے فنی اور معاشی مسائل
میں ایک بنیادی فرق ہے اسے تو ہم آسانی سے تسلیم کر سکتے ہیں کہ
بعض حدود کے اندر (جو فنی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں)
مشینوں اور افراد کو مخصوص کاموں میں لگا دینے سے فنی کارکردگی
میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن معاشی نقطہ نظر سے یہ تخصیص کس حد تک
مفید ہے اس کا دار و مدار بازار یا طلب کی وسعت پر ہے۔ ایک لوہار
کے لیے جو ایک مختصر سی اور الگ تھلگ جماعت کے لیے ایک
خاص قسم کی بندوقوں کے بنانے میں اس مقصد سے تخصیص کی کوشش
کہ اس طرح کثیر مقدار میں پیدا کرنے کے فوائد حاصل ہو سکیں گے
محض حماقت ہوگی، اس کے لیے تو بہتر یہی ہے کہ ایک خاص ناپ
کی بندوقوں کی ایک مقررہ تعداد بنا چکنے کے بعد وہ دوسرے ناپوں
کے بندوقیں بنانے میں مصروف ہو جائے، کیونکہ ان کی مزید تعداد کے لیے

طلب بھی باقی ہوگی، بہ نسبت ان بندوقوں کے جن کی کافی مقدار وہ پہلے ہی بنا چکا ہے۔

اسی طرح کسی خاص وقت میں متعین چیزوں کو کثیر مقدار میں پیدا کرنے کی خاص حدیں ہوتی ہیں، جب ان چیزوں کی طلب باقی نہ رہے یا ان سے زیادہ کسی اور چیز کو اہمیت دی جائے تو گویا یہ حدود آپہنچیں، ان حدود سے تجاوز کرنا نہ صرف اس معنی میں فضول خرچی ہے کہ سوسائٹی کی قوت پیداوار کو کم قیمت یا کم اہم چیزوں کے پیدا کرنے میں لگایا جا رہا ہے، بلکہ اس کمپنی یا جماعت کو جو ایسا کر رہی ہو مالی نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، عہد حاضر کے مروجہ عقائد کا یہ عجیب پہلو ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ بعض صنعتوں کے غیر متناسب طریقے سے بڑھ جانے سے معاشی نظام میں ہمیشہ سے زیادہ ابتری اور گڑبڑی پیدا ہوئی ہے لوگ انتہائی سادہ لوحی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم ہر اس چیز کو جس کا کثیر مقدار میں پیدا کرنا ہماری فنی واقفیت کے لئے ممکن ہو اگر بڑے پیمانے پر پیدا کرتے چلے جائیں، قطع نظر اس کے کہ اس کے لئے کوئی مانگ موجود ہے یا نہیں تو ہماری دقتیں ختم ہو جائیں گی مشین کی پوجا کا شاید یہ قدرتی انتقام ہے کہ فنی ماہروں سے بھری ہوئی دنیا کی عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں۔

اسی طرح اصل زر کی اہمیت کے متعلق بعض غلط فہمیاں رائج ہیں، جن کی بنیاد فنی صلاحیت اور معاشی اہمیت کے اسی امتیاز کے نہ قائم رکھنے پر ہے، بعض اوقات اس غلط خیال کی حمایت کی جاتی ہے

کہ اگر اصل زر کی کسی شکل میں بہت سارا روپیہ لگایا جائے تو یہ مناسب نہیں کہ اگر صارفین کی طلب یا خود فنی معلومات میں کوئی ایسا اضافہ ہو، جس کی مدد سے اسی چیز کو اور کم دام پر صارفین تک پہنچانا ممکن ہو گیا ہو تو اس اصل قائم کے استعمال سے دست کش ہو جایا جائے۔ اگر معاشی تنظیم کا مقصد طلب کی تسکین ہے تو اس کے اچھا یا برا ہونے کا معیار بھی یہی ہوگا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے اس تعین کے لیئے کوئی گنجائش نہیں باقی رہتی۔ فرض کیجیے، میں لندن سے گلاسگو کے لیے ٹکٹ خریدوں اور آدھا سفر طے کر چکنے کے بعد مجھے یہ اطلاع ملے کہ مجھے فوراً مانچسٹر پہنچنا چاہیے تو یہ میرے لیے عقل مندی کی بات نہیں ہوگی، کہ میں اپنا سفر جاری رکھوں محض اس لیئے کہ میں نے گلاسگو تک کے لیے ٹکٹ خریدنے پر پیسے صرف کیے ہیں جو واپس نہیں ہو سکتے یہ صحیح ہے کہ ٹکٹ اب بھی گلاسگو تک پہنچانے کے لیے کار آمد ہے، لیکن میرا مقصد بدل چکا ہے۔ اور شمال جانے کا جو حق قانوناً مجھے اب بھی حاصل ہے، وہ میرے لیے بے کار ہو چکا ہے، اب بھی سفر جاری رکھنا محض حماقت ہے معاشیات میں جیسا کہ جیوانس نے کہا ہے، ہم بار بار پیچھے مڑ کے نہیں دیکھتے۔

اسی طرح اگر ایک ایسی مشین کی بھی جس کی بنائی ہوئی چیزوں کے لیے مزید طلب باقی نہ رہ گئی ہو یا جو مختلف وجوہ کی بنا پر دوسری قسم کی ایک مشین کے مقابلہ میں کم نفع بخش رہ گئی ہو معاشی حیثیت میں تبدیلی ہو جائے گی، باوجود اس کے کہ وہ اب بھی

اس طرح کی چیزیں بنا سکنے کی صلاحیت رکھتی ہو مگر اب وہ فضول سمجھی جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر مانگ یا لاگت کی تبدیلی پہلے سے معلوم ہوتی تو ذرائع دوسری طرح استعمال ہوتے۔ لیکن ماضی میں جو غلطی ہو گئی وہ ہو گئی اور اس سے بحث کرنا اب فضول سی بات ہوگی۔ معاشیات کو جس سوال کا حل تلاش کرنا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ دیے ہوئے حالات میں معاشی توازن یا ہم آہنگی کے لیے کون سی تبدیلیاں ضروری ہیں، داخلی نظریۂ قدر پر دنیا جہان کے سبھی اعتراضات کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس پہلو پر جو نظری اور عملی دونوں ہی حیثیتوں سے اہم ہے روشنی ڈالنا اس نظریے کی ایک بڑی خدمت ہے

آئیے افراطِ زر کے معاشی اثرات کے متعلق مروجہ غلط فہمیوں پر بھی ذرا ایک نظر ڈال لیں۔ عملی معاشیات کے لیے زیر بحث تصور کی کیا اہمیت ہے، اس کی ایک آخری مثال یہ مسئلہ ہے، یہ ایک معلوم و مشہور حقیقت ہے کہ افراط زر کے زمانے میں تعمیری صنعتوں میں شروع میں غیر معمولی مشغولیت رہتی ہے،

مصنوعی اسباب کے زیر اثر شرح سود کی کمی کے باعث مشینوں وغیرہ کی بہت ہی بڑے پیمانے پر تجدید ہوتی ہے نئے کارخانے بنتے ہیں، پرانے کارخانوں کا سامان بدلا جاتا ہے، عوام کے لیے تو خوش حالی اور ترقی کا یہ نظارہ غیر معمولی طور پر دلچسپ ہوتا ہے اور جب افراط زر کے نتائج زیر بحث ہوں تو اکثر اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ افراط زر کی ایک بڑی خوبی ہے

که اس کے طفیل اس طرح کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جرمن افراط زر کے متعلق کتنے ہی آدمیوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اگرچہ اس کے نتائج بڑے دردناک تھے، اس سے کم سے کم یہ فائدہ تو ہوا کہ جرمنی کی صنعتوں میں مشینوں وغیرہ کی تجدید ہو گئی، پروفیسر اف، بی گریہم جیسے عظیم المرتبت ماہر معاشیات نے اس رائے کو اپنی حمایت کی عزت بخشی ہے، بہ ظاہر تو یہ بات ہی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی بنیاد بھی اس مادی تصور پر ہے جن پر ان دوسری غلط فہمیوں کی بنیاد ہے، جن سے ہم اوپر بحث کر چکے ہیں، کیونکہ کسی صنعتی نظام کی اچھائی کا دارو مدار اس پر نہیں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ مقدار میں نئی نئی مشینیں موجود ہوں قطع نظر اس سے کہ ان کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے لیے کوئی گاہک ہو یا نہ ہو، اور ان عناصر کی پیداوار کی قیمت جن کی مدد سے اس سامان سے کام لیا جا سکتا ہے کم ہو یا زیادہ، اچھائی کا معیار تو یہ ہے کہ سارے ذرائع کو طلب کی تسکین کے لیے کتنی کامیابی کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے، اور یہ آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ افراط زر کے زمانے میں شرح سود کی عارضی کمی بعض صنعتوں کو اس حد تک پھیلانے میں ممد ہوتی ہے کہ اس عارضی سہارے کے ختم ہو جانے ہی ان کو نفع بخش طریقے پر چلانا ناممکن ہو جاتا ہے، ساتھ ہی آزاد مالی وسائل کم یا ختم ہو جاتے ہیں، اور جب کساد بازاری کا زمانہ آتا ہے تو نظام کی کارکردگی پیداوار میں

رکاوٹیں محض اس لیے پیدا ہو جاتی ہیں کہ آزاد سرمایے کی کمی کے باعث شرح سود میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے منافع کی امیدیں کم ہو جاتی ہیں، اور ایسے اصل تائم کی ایک بڑی مقدار نظام کے گلے میں بوجھ بن جاتی ہے، جس سے منافع کا حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے، خوب صورت سی وہ مشینیں جو پہلے سب کے لیے تعجب اور خوشی کا باعث ہوتی تھیں، اب بھی ویسے ہی موجود ہیں مگر ان کی معاشی اہمیت فنا ہو چکی ہے، جرمن افراطِ زر کے زمانے میں یا مارک کی قیمت کے استحکام کے وقت تو شاید یہ باتیں بڑی دور از کار معلوم ہوتی ہوں، لیکن اس بدنصیب ملک میں سالہا سال کی "سرمائے کی قلت" کے پیش نظر اب شاید یہ اتنی عجیب نہ معلوم ہوں۔

لیکن اب ہمیں نظری مسائل کی طرف پھر رجوع کرنا چاہیے ہماری ان تعریفوں کا معاشی اعداد و شمار پر کیا اثر پڑتا ہے،

معاشی اعداد و شمار ناپ کے دو پیمانے استعمال کرتے ہیں، قیمت کا اندازہ اور مقدار کا اندازہ اتنے ٹن کوئلہ یا اتنے پونڈ کا کوئلہ، معاشی تحلیل کے نقطۂ نظر سے ان اندازوں کی کیا اہمیت ہے؟

جہاں تک مقدار متعلق اعداد و شمار کا تعلق ہے کچھ اور کہنے کی اب ضرورت نہیں رہ جاتی، اب یہ بتانے کے لیے کہ معاشیات کے نقطۂ نظر سے ان اعداد کی خواہ وہ کتنے ہی صحیح کیوں نہ ہوں اہمیت صرف اضافی اہمیت ہی ہے، اس میں شک نہیں کہ اگر تجربے سے بعض اشیا کی اہمیت کچھ دائمی یا طویل ثابت ہو جائے

تو ان اشیا کی مقداروں سے متعلق اعداد کی بھی بہت سے معاملات میں عمل معاشیات کے لئے بڑی اہمیت حاصل ہو جائے گی لیکن منطقی حیثیت سے ان کی یہ اہمیت محض اتفاقی ہو گی اور ان اعداد کی اہمیت ہمیشہ محض اسی لیے ہوتی ہو کہ ان کے پس منظر میں معاشی اہمیت بھی موجود ہو۔

قیمتوں سے متعلق اعداد بعض پیچیدہ مسائل کے پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں اور اب ہمیں انھی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا ہو،

قیمتوں کے موجودہ نظریے کے مطابق مختلف اشیا یا عناصر پیداوار کی قیمتیں ان کی اضافی کم یابی کا نتیجہ ہوتی ہیں، یا دوسرے الفاظ میں ان کا انحصار ان کی احتیاطی (marginal) اہمیت پر ہوتا ہو۔ ذرائع کی ایک دی ہوئی تقسیم کی موجودگی میں ہم ہر آدمی کے متعلق یہ تصور کر سکتے ہیں کہ جب وہ بازار میں داخل ہوتا ہو، بازار میں پہنچکر مختلف قیمتوں کی موجودگی میں جو اشیاء کی قلت کی منظہر ہوتی ہیں ہر شخص کو اپنے انفرادی "پیمانۂ قیمت" میں تبدیلی کرنی پڑتی ہو، یہاں تک کہ بازار میں مروجہ قیمتوں اور خود اس کے داخلی اندازوں میں ایک طرح کا توازن پیدا ہو جاتا ہو۔ قیمتیں گویا بازار میں آنے والی مختلف اشیا کی اہمیت یا رتبہ کو روپے آنے اور پائی میں ظاہر کر دینے کا نام ہو، کسی ایک چیز کی قیمت مختلف اشیا کی مروجہ قیمتوں کے ساتھ ساتھ ہی ہو، اس کی اکیلے کوئی اہمیت نہیں ہاں جب مختلف قیمتیں رُپے

آنے پائی میں بازار کے مروجہ درجہ داری ترتیب کے اظہار کا ذریعہ ہوں تو ان سے کچھ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں، ان کی ایک اہمیت ہے، جیسا کہ سیموئل بیلی نے ایک صدی پہلے کہا تھا۔ "جس طرح ہم کسی چیز کا فاصلہ کسی اور چیز کی مدد کے بغیر متعین نہیں کر سکتے، اسی طرح کسی ایک چیز کی قیمت کا تصور بھی بغیر اور قیمتوں کے تصور کی مدد کے ممکن نہیں، جس طرح ایک اکیلی چیز کا کوئی فاصلہ نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی ایک چیز فی نفسہٖ قیمتی نہیں ہو سکتی"

گویا تسلسل اور بعض تصورات پیدا کرنے کے لیے ہم نے "معاشی" مقادیر کی جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ درحقیقت بہت ہی گمراہ کن ہے، قیمت سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ کسی چیز کے حاصل کرنے کے لئے اتنے پیسے دینے ہوں گے، لیکن اس قیمت کی اہمیت تو اس تعلق میں ہے جو روپے کی اس تعداد میں اور دوسری اسی طرح کی رقموں میں ہے اور قیمتیں جس اہمیت کا اظہار کرتی ہیں وہ متعین اعداد نہیں، وہ تو بس ایک درجہ واری ترتیب کا پتہ دیتی ہیں، اور یہ فرض کرنا قطعاً غیر ضروری ہے کہ اضافی قیمتوں کی کوئی فہرست کچھ مقداروں کا پتہ دیتی ہے، قیمت ایک تعلق کا نام ہے، کوئی پیمانہ نہیں؛

لیکن اگر ایسا ہے تو گویا انفرادی قیمتوں یا افراد کی آمدنیوں کو جمع کر کے ایک قومی آمدنی کا تصور قائم کرنے کی اہمیت بہت ہی محدود ہے۔ قیمتیں اور آمدنیاں جہاں تک ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فلاں رقم کسی خاص مقصد کے لیے صرف کی گئی جوڑی جا سکتی ہیں، اور اس مجموعے کی مالی نقطۂ نظر سے ایک اہمیت ہے، لیکن ترجیح کی

کسی ترتیب، یا اضافی اہمیت کے کسی معیار کی حیثیت سے ان کا مجموعہ کوئی معنی نہیں رکھتا، اس معنی میں تو وہ ایک دوسرے سے باہمی تعلق کی موجودگی میں ہی کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ حقیقی آمدنی کے تصور کی نظریۂ زر کے لیے اہمیت تو ممکن ہے لیکن اس سے آگے تو یہ محض ایک رواجی اہمیت کا مالک ہے۔

اس نتیجہ کا وزن اور اہمیت دونوں ہی اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے، اس کا یہ ضرور مطلب ہے کہ قیمتوں کا ایک تفصیلی مجموعہ اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کہ اس سے کچھ رقموں کی ادائیگی یا اس کی ضرورت کا پتہ چلتا ہے۔

دنیا کی آمدنی زر، اور قومی آمدنی زر دونوں ہی تصورات محض نظریۂ زر کے لیے اہم ہیں —— ایک کی مدد سے بالواسطہ مبادلہ کا عام نظریہ سمجھ میں آتا ہے دوسرے کی اہمیت قیمتی معدنیات کی تقسیم سے متعلق رکارڈز کے نظریے کے لیے ہے۔ لیکن اس سے ان کی رواجی اہمیت میں کمی نہیں آتی، اگر ہم یہ فرض کر لینا چاہیں کہ لوگوں کی پسند اور تقسیم دولت میں تھوڑی مدت میں کوئی بڑی تبدیلیاں نہیں ہوتیں اور بعض قیمتوں کی تبدیلی ... قوم کی اکثریت کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے تو پھر قوم کی مجموعی آمدنی میں کمی بیشی کو ضرور ایک من گھڑت اہمیت دی جاسکتی ہے، اور اس سے کچھ فوائد بھی ممکن ہیں، اور اچھے سے اچھے ماہر اعداد و شمار نے بھی ان اندازوں کے لیے اس سے زیادہ کسی قیمت یا اہمیت کا دعوا نہیں کیا ہے۔ یہاں تو صرف اس پُرزور دنیا مقصود

ہے کہ جن مفروضات کا اس سلسلے میں سہارا لینا ضروری ہے وہ قطعی من گھڑت ہیں اور نظری اصولوں کی کسی تقسیم کی مدد انھیں حاصل نہیں ہے۔

ہمارا مقصد اور واضح ہو جائے گا، اگر تھوڑی دیر کے لیے ہم اس پر غور کریں کہ تقسیم دولت میں اہم تبدیلیوں کا اس مجموعے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، اور اس سلسلے میں اس تصور سے کیا مدد لی جا سکتی ہے۔ وقتاً فوقتاً بعض ملکوں کی قومی آمدنیوں کے اندازے کیئے گئے ہیں، اور ان مجموعوں کی بنیاد پر اس کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر دولت کی مساویانہ تقسیم کو مدنظر رکھکر تبدیلیاں کی جائیں تو مجموعی قومی آمدنی پر کیا اثر پڑے گا۔ اس سلسلے میں پروفیسر باؤلے اور سرجوزا سٹامپ کے ان اندازوں کا مقصد یہ ہے کہ یہ معلوم کریں کہ ابتدا میں کل کتنی رقم موجود ہے جسے نئے سرے سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ قیمتی اور اہم ہیں اور خود ان ممتاز ماہرین اعداد و شمار ان اندازوں کو اتنی ہی اہمیت کا مستحق سمجھا ہے، لیکن اس سے آگے ان اندازوں کو کوئی متعین رتبہ دینا بالکل بے سود ہے، کیوں کہ نئے سرے سے تقسیم دولت کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا، کہ خود لوگوں کی طلب میں تبدیلی ہوگی، اور نئی نئی چیزوں یا مختلف مقدار میں مختلف چیزوں کا پیدا کرنا لازم ہو جائے گا، سچ تو یہ ہے اگر اس مسئلہ پہ ہم ذرا اور دھیان دیں تو یہ نکتہ سامنے آئے گا، کہ اس طرح کے اندازوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا، کہ قوت پیداوار کی مقدار

کے متعلق جو اس طرح آزاد ہوگی وہ بہت ہی مبالغہ آمیز تصویر پیش
کریں گے، کیوں کہ امیر آدمیوں کی آمدنی کا بڑا حصہ دوسرے
امیر آدمیوں کی موجودگی کا نتیجہ ہوتا ہے، وکلا، ڈاکٹر، یا اچھی
جگہوں کے مالک بڑے بڑے معاوضے اس لیے حاصل کر لیتے
ہیں کہ سوسائٹی میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ بڑے معاوضے
ادا کر سکتے ہیں، آمدنیوں کی تقسیم از سرِ نو کر دیجیے، اور اگر اس
کے بعد متعلقہ ذرائع پیداوار کی فنی نقطہ نگاہ سے صلاحیتِ
پیداوار میں کوئی فرق نہ بھی آیا ہو تو بھی لوگوں کے نزدیک
اشیا کی اہمیت کا معیار بدل چکا ہوگا، اور اس لیے ان ذرائع
کی اہمیت اور قیمت اثر پذیر ہوگی، آمدنی کی ایک مقررہ مقدار
خرچ کی ایک مقررہ رفتار کی موجودگی میں یہ یقینی ہے کہ اولین
نتیجہ یہ ہوگا، کہ ان اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا، جو مزدوروں
کے استعمال میں آتی ہیں، پیشوں کی تقسیم کے اعداد و شمار کو
سامنے رکھیے تو یہ نتیجہ بالکل واضح نظر آتا ہے. لیکن روپے آنے
پائی میں جب قومی آمدنی کا حساب لگایا جائے گا، تو یہ حقیقت
چھپ جائے گی حالاں کہ اکثر اس طرح کے اندازوں پر مایوسیت
کا الزام لگایا جاتا ہے، آبادی کا جو تناسب اب امیروں کے کام
کی چیزیں بنانے میں لگا ہوا ہے اگر اسے ہم غریبوں کا کام کرنے
میں لگا دیں تو اس طرح جو اضافہ ہوگا، وہ بہت ہی معمولی اور
نظر انداز کر دینے کے قابل ہوگا، اور اگر اس اندازے کو زیادہ
صحیح تر کرنے کے لیے ہم رقموں کا سہارا لیں تو اس اندازے میں،

دولت کی آمدنی میں جتنا بھی زیادہ فرق ہوگا، اتنی ہی ہماری بڑی غلطی ہوگی۔

۵۔ قیمتوں کے اس تصور کا جو انھیں ترجیح کی ایک ترتیب کا مظہر سمجھتا ہے، ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ مختلف قیمتوں کا باہمی مقابلہ کوئی معنی نہیں رکھتا الا آنکہ ان مختلف اشیا کا باہم مبادلہ بھی ممکن ہو۔

اس لیے مختلف زمانوں میں مروجہ قیمتوں کے باہم تقابل سے کوئی اہم نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ مثلاً اگر پچھلے سال روٹی کی قیمت ۶ پنس رہی ہو اور اس سال وہ گھٹ کر ۴ پنس رہ گئی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سال روٹی کی تعداد پچھلے سال سے کم کمیاب ہے، ان دو قیمتوں کے باہمی تقابل سے کوئی مفید نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر یہ ممکن ہو کہ پچھلے سال کی مروجہ تمام قیمتوں کا اس سال کی تمام قیمتوں سے مقابلہ کیا جا سکے تو اس سے مفید نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں، کیوں کہ دراصل اہم تو یہی رشتے ہیں کہ ایک روٹی کی دوسری مختلف اشیا کے مقابلے میں کیا اہمیت رہی اور اس میں اضافی اہمیت کا ہی کوئی نتیجہ خیز باہمی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ذکر کر دینا چاہیے۔ جو اس سلسلے میں رائج تھی، خیال تھا کہ انفرادی قیمتوں کی تبدیلی کو اگر زر کی قیمت میں تبدیلی کی روشنی میں دیکھا جائے تو ساری

دقتیں ختم ہو جائیں گی، اور اس میں شک نہیں کہ اگر زیر بحث چیز کے علاوہ ہر دوسری چیز کا ایک دوسرے سے رشتہ ایک ہی رہ جائے اور تبدیلی محض اس چیز کی طلب و رسد میں اور زر کی مقدار میں ہو تو یہ طریق کار کافی تھا، یعنی اگر ابتدائی قیمتوں کا باہمی تعلق کچھ اس طرح کا رہا ہو

ا = ب = س = ج = د . . . . . . (۱)

اور دوسرے وقت میں یہ تعلق اس طرح بدلا ہو کہ

ا = ½ ب = ½ س = ½ ج = ½ د . . . . (۲)

تو مسئلہ آسان ہے اور باہمی تقابل مفید۔ لیکن اس طرح کا باہمی، تعلق قیمتوں کے لیے ممکن نہیں الّا آن کہ بہت سے حادثات واقع ہو جائیں جو مختلف چیزوں کی قیمتوں میں تبدیلی کی باہم تلافی کر دیں۔ اور اس کا سبب محض یہ ہی نہیں کہ دوسری چیزوں کی طلب یا دوسری چیزوں کے شرائط پیداوار میں تبدیلی ممکن ہے۔ بلکہ ایسا اس لیے بھی ہے کہ ہر تبدیلی خواہ وہ زر کی مقدار کی تبدیلی ہو یا دوسرے "حقیقی" اسباب کا نتیجہ جس کا ہم تصور کر سکتے ہیں ایک دوسرے سے مختلف اشیا کے تعلق پر جداگانہ اثر ڈالے گی، یعنی اگر اتفاقی "تلافی کن (compensatory)" حادثات نہ واقع ہوں تو دوسری شکل میں ہماری مثالی تعدیل (Equation) کی شکل وہ نہیں ہوگی، جو ہمارے دوسرے اکویشن کی ہے۔ بلکہ اس کی شکل کچھ اس طرح کی ہوگی۔

الف = ½ ب = ¼ س = ¾ ج = د ۔۔۔۔ (۳)

حقیقی تبدیلیوں کے متعلق تو یہ بات زمانے سے مانی جاتی ہے۔ اگر الف کی طلب میں تبدیلی ہو تو یہ بات بہت ہی غیر یقینی ہے کہ ب، س، ج اور د کی طلب میں تبدیلی ایسی ہی ہوگی کہ الف اور ب کی قیمت کا تناسب یا رشتہ وہی ہوگا جو ج اور د کی قیمت کا۔ فنی تبدیلیوں کی بنا پر جو ذرائع پیداوار الف کے بنانے سے چھوٹیں گے ضروری نہیں کہ وہ دوسری چیزوں کے بنانے میں اس تناسب سے ہی لگائے جائیں کہ پرانا باہمی تعلق برقرار رہے۔ لیکن یہی بات زر کی لائی ہوئی تبدیلیوں کے متعلق بھی صحیح ہے، اور یہ بات معمولی سی کوشش سے ثابت کی جاسکتی ہے۔ کسی ایسی تبدیلی زر کا تصور بھی ممکن نہیں معلوم ہوتا جو مختلف قیمتوں کے باہمی تناسب پر یکساں اثر ڈالے لیکن اگر ایسا ہو تو ایک چیز کی قیمتوں میں تبدیلیوں کو زر کی قیمت میں تبدیلی کے لحاظ سے ٹھیک کرلینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ سیموئل بیلی کا خیال صحیح ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک چیز کی قیمت فلاں گذرے ہوئے سال میں یہ تھی، تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی دوسری چیز کے مبادلہ میں اس کی ایک متعین مقدار دینی پڑتی تھی۔ لیکن ایک اکیلی چیز کی قیمت کی تبدیلیوں کے متعلق دو مختلف زمانوں میں یہ بات کہنا صحیح نہیں۔

اس رلے کی ٹھیک اہمیت کیا ہے؟ مختلف زمانوں

میں مروجہ قیمتوں کے باہمی تقابل کے امکان سے انکار نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ مستقبل میں قیمتوں کے رجحان کے اندازے کا حال کی قیمتوں اور اندازوں پر گہرا اثر پڑتا ہے، آج کوئی چیز دے کر مستقبل میں کسی چیز کی خرید کا سودا کیا جا سکتا ہے اور ایسے نکتۂ توازن کا تصور ممکن ہے جو آج کی مروجہ قیمتوں کو مستقبل میں آنے والی قیمتوں سے ہم آہنگ کر دے، یہ نکتہ صحیح ہے اور اہم بھی، مستقبل میں کیا قیمتیں رائج ہوں گی، اس کے متعلق مختلف اندازے لگائے جاتے ہیں، اور ان مختلف اندازوں پر حال کی قیمتوں کا اثر پڑتا ہے۔ یہ ضروری بھی ہے اور صحیح بھی لیکن مروجہ قیمتوں اور ماضی کی قیمتوں میں باہم اس طرح کا کوئی ضروری واسطہ نہیں اور نہ ان کی اضافی اہمیت میں باہم کوئی تعلق ضروری ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ توازن کی تبدیلی کا تصور ایک فرضی تصور ہے، اور اس تصور میں حقیقت اتنی ہی ہوتی ہے جتنا کہ واقعات سے صحیح ثابت ہو جائے۔ کیوں کہ زمانے کے ساتھ حالات میں تبدیلی ہوتی ہے، اور اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ہر متعین لمحہ میں توازن کے رجحانات موجود ہوں، لیکن مختلف اوقات میں توازن کی کسی ایک شکل کی بقا کے رجحانات کا لازمہ نہیں ہوتے، زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ قیمتوں میں عدم موزونیت یا بے جوڑپن کا پیدا ہونا تقریباً ناگزیر ہے، مستقبل قریب حال پر اثر انداز ہوتا ہے، لیکن ماضی سے بحث بالکل غیر ضروری ہے کیونکہ ماضی کے اثرات اب ہماری بحث کا نقطۂ آغاز بن چکے ہیں، جہاں تک اشیا کی اہمیت

کے تعین کا سوال ہی ماضی اور حال میں انفرادی طرزِ عمل بالکل غیر متعلق ہے۔

یہاں بھی ہمارا منشا یہ نہیں کہ مختلف زمانوں کی مختلف مروجہ قیمتوں کا باہمی تقابل کسی اہمیت یا افادیت کا حامل نہیں یا مختلف قیمتوں کو مناسب طور پر بنائے ہوئے اشاریوں کی مدد سے "ٹھیک" کرنے کی کوشش بے سود ہے، کیوں کہ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ عمل معاشیات کے بعض مسائل اور تاریخ کی توضیح کے لیے اشاریوں کی مدد بہت ہی نتیجہ خیز ہے، بعض قیمتوں کو ایک رواجی اہمیت کا حامل تسلیم کر لینے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح سے اخذ کیے ہوئے نتائج عملی طور پر بہت مفید ہو سکتے ہیں، مطلب تو صرف یہ واضح کر دینا ہے کہ یہ نتائج محض نظری تحلیل کی مدد سے اخذ نہیں کیے جا سکتے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ بعض رواجی تصورات سے مدد لی جائے، جس میں تجربے کے بعض مشاہدات یا مختلف قیمتوں کی اضافی اہمیت کے متعلق بعض ذہنی تصورات خود بہ خود قائم کر لیے جائیں کہ فلاں چیز فلاں شخص کے لیے زیادہ اہم اور فلاں کے لیے کم۔

۶۔ معاشی اعداد و شمار کی تشریح ہی موضوع کے اس تصور سے تنہا اثر پذیر نہیں ہوتی، نظری معاشیات کے مرکزی تصورات کی ترتیب اور تشریح میں بھی اس سے بڑی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی تحقیق کے فوائد کی یہ ایک بڑی

دل چسپ مثال ہی، ہم نے اپنے مطالعے کی ابتدا اس مقصد سے کی تھی کہ معاشیات کے کلیات کے موضوع کو اور زیادہ ٹھیک ٹھیک طرح سے بیان کردیں اور اب ہم ایسی جگہ پر پہنچ گئے ہیں، جہاں یہی نہیں کہ ان کلیات کے اہم ترین اور محض اتفاقی پہلوؤں کو الگ الگ کرلیں بلکہ یہ بھی کہ ہم انھیں دوبارہ اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ ان کی اہمیت کو اور واضح کردیں۔ آئیے ذرا اس پر تھوڑا سا وقت صرف کرلیں۔

معاشی مسائل کے مطالعے کا روایتی طریقہ جو کم سے کم انگریزی بولنے والے ماہرینِ معاشیات کا مانا ہوا طریقہ تھا، یہ تھا کہ وہ ابتدا میں دولت کی پیداوار اور تقسیم کے اسباب سے بحث کرتے تھے۔ معاشیات کے موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، ایک تو نظریۂ پیداوار، دوسرے نظریۂ تقسیم دولت اور ان نظریات کا مقصد یہ تھا، کہ وہ "مجموعی پیداوار" کی مقدار کا تعین کرنے والے اسباب اور مختلف عناصر پیداوار اور مختلف افراد کے درمیان تقسیم کے تناسب کے اسباب کی تشریح کریں۔ ان دونوں سرخیوں کے تحت کی بحثوں میں کبھی کبھی تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوتی تھیں، نظریۂ قدر کو ان دونوں تقسیموں میں کہاں جگہ دینا مناسب ہی؟ یہ سوال بڑی دقتوں کا باعث رہا ہی۔ لیکن عام طور پر یہ کہا جاسکتا ہی کہ ابھی حال تک معاشیات کے موضوع کے جسم میں یہی ایک "زخم" تھا۔

اور بہ ظاہر اس تقسیم کے جواز کے لیے بہت مناسب وجہیں معلوم ہوتی ہیں، جیساکہ پروفیسر کینن نے زور دیا ہے اجتماعی طرز عمل کے تعین کے پیش نظر ہم جن مسائل میں دل چسپی لیتے ہیں وہ دو ہی قسم کے مسائل ہیں، پیداوار دولت اور تقسیم دولت، اگر کسی ٹیکس کے لگانے کا یا کوئی سرکاری مدد دینے کا سوال زیر بحث ہو تو جو سوالات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں (چاہے ان سوالات کا مفہوم ہمارے دماغ میں واضح نہ ہو) وہ یہ ہیں۔ پیداوار پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ اس لیے یہ کچھ عجیب بات نہیں کہ ماضی میں معاشیات کے ماہرین نے اپنے کلیات کو انھی دو اہم سوالات کے جواب کے تحت ترتیب دیا ہے۔

لیکن اگر معاشیات کے موضوع کی ماہیت اور معاشی "اعداد" کی اضافیت کے تصورات جنھیں ہم نے اس مقالہ میں پیش کیا ہے۔ ہم اپنے ذہن میں رکھیں تو یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ اس نقطۂ نظر سے معاشیات کی روایتی ترتیب میں بعض نمایاں نقائص ہیں۔

اس اصول پر معاشیات کے موضوع کی جو تقسیم ہوتی ہے اس میں لازماً بہت سے فنی مسائل داخل ہو جاتے ہیں۔ جن کا شمول کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

نظریۂ پیداوار دولت میں معمولی قسم کی باتیں شامل ہوگئی ہیں، ان کے وجود سے ہم سب کو پروفیسر سمیپیڈ کی طرح ندامت سی محسوس ہوتی ہے خود کاشت زمینداری کارخانوں کی تنظیم،

صنعتی نفسیات، فنی تعلیم وغیرہ مسائل جو اس اصول کے مطابق مرتب شدہ بہترین تصانیف میں بھی جگہ پا جاتے ہیں، انتہائی پیش پا افتادہ مسائل ہیں جن کی معاشیات میں شمولیت واقعی باعثِ توہین ہے۔

لیکن اس طریق کار پر ایک اور بنیادی اعتراض بھی ہے، اس میں لازماً صحت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ علمی کلیات

اگر واقعی کلیات کا رتبہ حاصل کرنا چاہیں تو یہ ضروری ہے کہ انہیں بالکل ٹھیک اور قطعیت کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ اس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ ایک آیندہ باب میں ہم بتائینگے کہ ان کے لئے کمیت کی قطعیت ضروری ہے۔ قانون طلب کو اعداد کی شکل میں بیان کرنا اس سے اہم نتائج کے استنباط کی لازمی یا قطعی شرط نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا تعلق ایسے امور سے ہونا چاہیئے جن کا واضح اور قطعی تصور ممکن ہو، مگر پیداوار کی مجموعی مقدار میں تبدیلی کا تصور کوئی واضح تصور نہیں ہے ہم چاہیں تو بعض اشاریوں کو کچھ رواجی اہمیت دے کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیداوار میں تبدیلی اس مخصوص اشاریے میں تبدیلی کے مرادف ہے، بعض مقاصد کے لیے تو یہ طرزِ عمل مفید بھی ہے، لیکن اس کے لئے کوئی اصولی وجہ جواز موجود نہیں کیوں کہ یہ طرزِ عمل "معاشی اشیا" کے تصور سے اخذ نہیں کیا جا سکتا، اور قطعیت کے معیار کو اگر سامنے رکھا جائے تو تجربے کی بنا پر پیداوار پر اثر انداز ہونے والے اسباب کے متعلق

کسی ایسے کلیے کی تعمیر ممکن ہی نہیں جسے ہم قانون کا درجہ دے سکیں۔ کیوں کہ قانون کا تعلق واضح تصورات اور متعین رشتوں سے ہونا چاہیے۔ اور مجموعی پیداوار میں تبدیل کا تصور کوئی واضح تصور نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اس معنی میں پیداوار دولت کے متعلق کسی ایسے تصور کی وضاحت کی ہی نہیں گئی جسے "قانون" کا رتبہ دیا جا سکے، معاشیات کے ماہرین کے وضع کردہ کلیات کو قانون کی اہمیت حاصل ہوئی ہے تو لازماً ان کا تعلق مجموعی پیداوار جیسے غیر متعین تصورات سے نہیں بلکہ بہت ہی واضح اور قطعی تصورات مثلاً قیمت، رسد، طلب وغیرہ سے رہا ہے، رکارڈو کے نظام میں جو اس نقطۂ نگاہ سے دوسرے تمام نظاموں کے لیے نقشِ اول کا کام دیتا رہا ہے۔ بحث کا موضوع یہی ہے کہ متعین اور واضح تصورات اور مقادیر کے توازن کے رجحانات کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ مختلف قسم کی معاشی اشیا یا مختلف معاشی اشیا کی باہمی شرح مبادلے کے مسائل کی بحثوں میں جو کلی قواعد وضع ہوئے، ان سب نے قوانین کا درجہ پالیا۔

اسی وجہ سے آج کل معاشیات کے ماہرین کا بڑھتا ہوا رجحان یہی ہے کہ پرانی ترتیب کو بدل دیا جائے۔ اب ہم پیداوار اور تقسیم دولت کی تبدیلیوں کے اسباب سے

بحث نہیں کرنا، بلکہ ہماری تحقیق کا موضوع یہ ہوتا ہی کہ متعین حالات میں مختلف معاشی "مقادیر" کے توازن کی کیا شرطیں ہوں گی، اور اگر مفروضہ حالات میں کوئی نظریۂ پیداوار دولت اور نظریۂ تقسیم دولت کے دو حصوں میں تقسیم نہیں کرتے، اس کی بہ جائے ہم ایک نظریۂ توازن، ایک نظریۂ سکون، اور ایک نظریۂ تغیر متبدل کی تشریح کی کوشش کرتے ہیں، معاشی نظام کو ایک ایسی بڑی مشین فرض کر کے جس کا کام یہ ہو کہ اشیا کی ایک مجموعی پیداوار کو کس تناسب سے تقسیم کیا جائے گا۔ اس کے برخلاف ہمارے ذہن میں معاشی نظام کا جو تصور ہی وہ یہ ہی کہ یہ نظام انسان اور معاشی اشیا کے باہمی تعلقات کا، جو ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں، لیکن جن کا الگ الگ واضح تصور ممکن ہی نام ہی، اور پھر ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کن حالات میں یہ رشتے قایم رہیں گے، اور مقصد بامنہاج ہیں جن کے بیچ میں یہ رشتے وجہ اتصال ہیں تبدیلی کے کیا نتائج ہوتے ہیں اور ایسے تغیرات کیوں اور کب وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

اپنی انتہائی مکمل شکل میں تو یہ رجحان بہت ہی نیا ہی، لیکن ویسے اس کی ابتدا کے آثار تو سائنٹفک معاشیات سے متعلق بہت ہی ابتدائی زمانے کی تحریروں میں ملتے ہیں، مثلاً کسے نا کی کتاب (تابل یو اکونامیک) بنیادی طور پہ

موجودہ نظریۂ توازن کے ہی اطلاق کی ایک کوشش تھی،
اور اسی طرح اگرچہ اے ڈم اسمتھ کی معرکۃ الآرا کتاب کا موضوع
دولت کے اسباب کا پتا چلانا تھا۔ اور جس میں واقعی خوش
حالی کے اسباب کے متعلق بہت سی کام کی باتیں جو عملی
معاشیات کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں، کہی گئی تھیں لیکن
نظری معاشیات کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اس کتاب کا مرکزی
اور اہم ترین کارنامہ یہ تھا کہ اس میں اس سوال کا کہ تقسیم کار
کو متوازن رکھنے میں مختلف قیمتیں کس طرح معاون ہوتی ہیں
شافی جواب موجود ہے، اور جیسا کہ پروفیسر الن ہنگ نے
کہا ہے، یہ رائے لوزان اسکول کے انتہائی ترقی یافتہ عہد
کے تحلیل سے ہم آہنگ ہے۔

نظریہ قیمت اور تقسیم دولت کلاسیکی اسکول کے مطالعہ کے
مرکزی موضوع تھے اگرچہ انھوں نے ان کو مختلف ناموں کی آڑ میں
چھپانے کی بڑی کوشش کی۔ محصولوں اور سرکاری امداد کے اثرات
کی نظری تشریح ہمیشہ ایسی اصطلاحوں میں کی گئی ہے جو تقابلی سکونیات
کے موجودہ طریق کار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس طرح اگرچہ
موجودہ نظری معاشیات کی شکل بظاہر نئی ہے اس کا اصل مدعا
وہی ہے جو پرانے نظریات کے اہم ترین اجزا میں بیان کیا گیا
تھا۔ موضوع کی موجودہ ترتیب سے پرانے نظریوں کی بنیادوں
کی وضاحت ہو جاتی ہے اور ہمارے طریق کار کو ایک عمومیت
حاصل ہو جاتی ہے۔

ان نئی باتوں سے تو نظری معاشیات کے کافی بڑے حصہ کو معاشیات سے خارج کر دینا پڑے گا۔ حالاں کہ یہ واقعی بہت ہی مفید اور کار آمد ہیں۔ لیکن اس طرح کا شبہ نئے طریق کار کے امکانات سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہوگا، بغیر کسی خوفِ تردید کے یہ کہا جا سکتا ہو کہ سبھی اہم نظریے جو پرانے نظام میں جگہ رکھتے تھے، نئے طریق کار کی روشنی میں واضح ہو جاتے ہیں فرق صرف اتنا ہو کہ نئے طریق کار میں ہر ہر قدم پر ہم اپنے علم کے نتائج اور حدود سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہیں مثلاً خالص نظری تحلیل مسائل کی حدود سے باہر قدم رکھکر جب ہم عملی معاشیات کے کسی رواجی مفروضے کا سہارا لیتے ہیں تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، کبھی بھی ہم اس غلطی میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کسی ایسے نتیجہ یا تصور کو جو ہم نے رواجی مفروضات کی مدد سے اخذ کیا ہو اپنے موضوع کے بنیادی مفروضات سے مستنبط سمجھیں۔

لیکن اس طریق کار کے اختیار کرنے سے فائدہ کیا ہو! اس کی ایک اچھی مثال تنظیم پیداوار کے مسئلے کا مطالعہ ہو، اس مسئلے کی پرانی بحثیں بہت ناتشفی بخش ہیں، اسمتھ سے لیے ہوئے تقسیم کار کے پیش پا افتادہ فوائد کی فہرست ———— اور پھر صنعتی تنظیم کی مختلف شکلوں سے تفصیلی بحث، اور پھر قومی خصوصیات سے متعلق کچھ غیر سائنٹیفک اور بے معنی کلیات، اور آخر میں شاید صنعتوں کے مقامی اجتماع کے متعلق ایک باب، بس

یہ بھی کل کائنات۔ یہ سارے مسائل ایسے تھے جو معمولی سمجھ رکھنے والوں کی بھی سمجھ میں آسکتے تھے، اور پھر انتہائی غیر دل چسپ لیکن اس سے قطع نظر ان میں بعض سخت خرابیاں تھیں، اس نظریے کے مطابق معاشیات کے طالب علم کے نقطۂ نظر سے "تنظیم" گویا اندرونی صنعتی (یا زرعی) تنظیم کا نام ہو" اندرونی" یا تو متعلقہ قوم کی ترتیب کے معنی میں یا اگر اس سے آگے قدم بڑھا تو متعلقہ صنعت کی تنظیم۔ مگر اس آخری تصور کی تشفی بخش وضاحت کی کوشش کبھی نہیں کی گئی تھی۔ ساتھ ہی پیداوار کی تنظیم کے تعین میں جو عناصر سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، یعنی خرچ اور قیمتوں کا باہمی تعلق، ان کے لئے اس میں کسی کی بھی جگہ نہیں تھی۔ یہ بحثیں موضوع کے ایک دوسرے حصے میں آتی تھیں جس کا کام "قیمت" سے متعلق مسائل کی تشریح و توضیح تھی، نتیجۃً (اور یہ ہر ایسے استاد کے تجربے میں آئی ہوگی جسے پرانی تقسیم کے مطابق تربیت یافتہ دماغوں سے واسطہ پڑا ہو) یہ عام بات تھی کہ نظریہ قیمت اور اس کی تمام دقائق سے پوری واقفیت حاصل کرلی جائے، اور شرح سود کے متعلق لغو دلائل کی باتوں میں گھنٹے صرف کر دیے جائیں لیکن پھر بھی پیداوار کی تنظیم میں قیمتوں، اخراجات اور شرح سود کی اہمیت کا بالکل احساس نہ ہوتا تھا۔

موجودہ طریقِ کار میں ایسا ممکن نہیں، پیداوار کے مسائل کا مطالعہ نظریۂ توازن کا لازمی جز ہو۔ اب سب سے پہلے یہ بتایا جاتا ہو کہ کس طرح قیمت اور صرف کے عمل اور ردعمل کے

نتیجے کے طور پر مختلف اشیا کے پیدا کرنے میں ذرائع پیداوار کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ اور کس طرح متعین حالات میں سود کی شرحیں اور صرف اور قیمت کے فرق (نفع) سے حال اور مستقبل کے لیے پیدا کرنے میں ذرائع پیداوار کی تقسیم ہوتی ہے۔ تقسیم کار کا نظریہ جواب سے پہلے ایک بے لطف فنی سوال تھا۔ توازن کی تبدیلی کے نظریے کا ایک اہم حصہ قطعہ آتا ہے۔ اندرونی تنظیم کے مسئلے کے لیے اب بھی گنجایش رہتی ہے، لیکن اب وہ اضافی قیمتوں اور اخراجات کے بیرونی اثرات سے متعین شدہ ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ عملی زندگی میں یہی ہوتا بھی ہے اور اس لیے جو چیز بظاہر بہت ہی نظری معلوم ہوتی ہے، دراصل ہمیں حقیقت سے قریب تر لانے کا ذریعہ ہے۔

(۴)

معاشی قوانین کی ماہیّت

اب ہم معاشیات کے موضوع سے خاطر خواہ واقفیت حاصل کر چکے ہیں اور اس کے بنیادی تصورات سے بھی ہم کماحقہٗ آگاہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی معاشی کلیات کی ماہیت کا مطالعہ باقی ہی، معاشی کلیات کی ہی مدد سے ہم ان مختلف معاشی تصورات کے اتحاد کا پتہ لگا سکتے ہیں، اس لیے ہمیں اب معاشی قوانین کی ماہیت اور ان کے استنباط کے مسائل سے بحث کرنا چاہیے اور اس باب کا عنوان یہی ہی، ان مسائل کے حل کر لینے کے بعد ہمارے لیے دوسرا اہم کام یہ باقی رہ جائے گا. کہ قوانین کی اہمیت اور ان کے اطلاق کے حدود کا تعین کر لیں۔

معاشیات نے ابتک جو کچھ حاصل کر لیا ہی اسی کی بنیاد پر کچھ نتائج اخذ کرنا ہمارے اس مقالے کا مقصد ہی، اس لیے ہم کو اس بحث سے بس برن ہی بر سبیل تذکرہ ہی واسطہ ہوگا کہ معاشیات کا مطالعہ کس طرح کرنا چاہیئے، بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہی کہ جہاں تک سمجھ دار لوگوں کا تعلق ہی یہ بحث بے معنی سی ہو چکی

ہی۔ ہمیں اصل مطلب تو اس سے ہوگا۔ کہ معاشیات کے ماہرین
نے معاشی تحلیل کی مدد سے اب تک جو نتائج اخذ کیے ہیں اُن کی
اہمیت کیا ہی۔ اس مقصد کے لیے زیادہ سہل طریقہ یہ ہوگا کہ معاشیات
کے بعض قوانین کو مثال کے طور پر ہم اپنے سامنے رکھیں اور پھر
یہ پتہ لگانے کی کوشش کریں کہ اِن قوانین کا ماخذ کیا ہی، اور ان
کی اہمیت کیا، بہ نسبت اس کے کہ ہم معاشیات کی بنیادی تقسیموں
سے ہی معاشی قوانین کی اہمیت کا تعین کرنے کی کوشش کریں۔

معاشی تحلیل کے اہم ترین اصول نظریہ قدر سے تعلق رکھتے
ہیں، معاشیات کے سب ہی اسکولوں کے نزدیک خواہ وہ معاشیات
کے موضوع کی کوئی سی بھی ترتیب مانتے ہوں، اس علم کے سارے
نظام میں ان اصولوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہی، جن کی مدد سے
اوّل درجے کی اشیا کے باہمی تعلق اور اس تعلق کی نوعیت
کا پتہ لگا سکیں، یہ کہنا تو ابھی قبل از وقت ہی کہ موضوع
کے اس حصے کے نظری پہلو مکمل ہو چکے ہیں، لیکن یہ تو طی ہی کہ اس
مسئلہ پر اب تک جو بحثیں ہو چکی ہیں ان کی روشنی میں ہم یہ کہتے ہیں
حق بہ جانب ہیں کہ بنیادی تصورات کے متعلق اب کوئی اختلاف
رائے باقی نہیں رہا ہی، اس لیے اب ہم کو یہ پتہ لگانے کی کوشش
کرنا چاہیے کہ ان قوانین کی سچائی کا دار و مدار کن باتوں پر ہی یہ ثابت
کرنے کے لیے تو زیادہ وقت صرف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں
کہ اس تعلق کی بنیاد صرف تاریخ کی مدد سے معلوم نہیں کی جا سکتی
بعض حوادث یا واقعات ایک ہی زمانے میں اگر بار بار وقوع پزیر

ہوں تو اس سے یہ سوال تو پیدا ہوتا ہی کہ یہ واقعات ان مخصوص حالات کے ساتھ بار بار کیوں ہوتے ہیں، لیکن خود اس اتفاقی بات سے ان مختلف واقعات میں سبب اور اثر کے تعلق کا پتا نہیں لگتا۔ یہ تو ثابت کیا جا سکتا ہی کہ جب کبھی بھی نظریہ قیمت کے بدیہی نتائج کی مفروضہ شرطیں پوری ہوتی ہیں تو واقعی نتائج وہی ہوتے ہیں، جن کی نظری حیثیت سے ہمیں توقع ہوتی ہی۔ مثلاً جب کبھی بھی آزاد بازاروں میں قیمتیں سرکاری طور پر متعین کی گئی ہیں تو اس کا نتیجہ یا تو یہ ہوا ہی کہ لوگ ان قیمتوں پر خرید و فروخت سے بچنے لگے ہیں، یا پھر اشیا، کی تقسیم میں اسی قسم کی گڑبڑ پیدا ہوئی ہیں، جن کی مثالیں روس اور فرانس کے انقلابات یا پچھلی جنگ کے دوران میں دیکھنے میں آتی تھیں، جب کھانے کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے لوگ لمبی لمبی قطاریں لگا کر کھڑے ہوئے ملتے تھے، اور باہمی جنگ و جدل اور گھنٹوں کے انتظار کے بعد بھی بہتوں کو خالی ہاتھ واپس ہونا پڑتا تھا۔ لیکن محض ان واقعات کی بنا پر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ قیمتوں کے تعین اور اس طرح کی ابتری میں باہم سبب اور اثر کا کوئی گہرا تعلق ہی، اور نہ مستقبل میں ان کے باہمی تعلقات کے متعلق کوئی پیشین گوئی کرنے کے لیے یہ معلومات کافی کہی جا سکتی ہی، جب تک ہم عقلی طور پر کچھ ایسی باتوں کا پتہ نہ لگالیں جن سے یہ معلوم ہو جائے کہ ان میں آپس میں کوئی گہرا سبب اور اثر کا تعلق ہی۔ ہمارے یہ فرض کرنے کے لئے کہ "تاریخ اپنے کو

دہرائے گی" کوئی کافی سبب موجود نہیں ہے، کیوں کہ تاریخ اور منطق دونوں ہی اس بات پر متفق ہیں کہ تاریخ کے جزئی واقعات سے کلی نتائج اخذ کرنے کی کوئی "کوشش" جسے تحلیل کی عطا کردہ بصیرت کی مدد حاصل نہ ہو پیش بینی کے لیے کمزور ترین بنیاد ہے، عہد حاضر کے فلسفۂ تاریخ کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس نے اس قسم کے دعووں سے قطعاً ہاتھ اٹھا لیا ہے، بلکہ اب تو تاریخ اور فطری علوم میں بنیادی امتیاز یہی سمجھا جاتا ہے کہ تاریخ تجرید کی بنا پر کلی قواعد کے وضع کرنے سے پہلو بچاتی ہے۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ ہمارے یقین کی بنیاد متعین تجربات پر بھی نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ جس مخصوص واقعہ کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ حکومتوں کی مداخلت سے بارہا یہی نتائج وقوع پذیر ہوتے ہیں، اور ان مختلف مواقع پر بہت سی ایسی باتیں بھی ساتھ ساتھ ہوئی ہیں جو ایک دوسرے سے بڑی یکسانیت رکھتی ہیں اور اس لیے ایک حد تک یہ کہنا بھی جائز ہے کہ "یہ متعین تجربات" کی نوعیت رکھتے ہیں، لیکن ان "تجربات" کے نتائج سے نظریۂ قدر کے بنیادی تصورات کی تائید کا کام لینا انتہائی سطحی طرز استدلال ہوگا، ان "تجربات" سے تو ہم خود ان نتائج کی تائید کا بھی کام نہیں لے سکتے خصوصاً اگر ان کے اطلاق کے دائرے کو ہم وسعت دینا چاہیں۔ ایسی کمزور بنیادوں پر علم کی عمارت تعمیر کی جائے گی تو وہ یقیناً بڑا اچھا سا علم ہوگا، لیکن نظریۂ قدر کے قوانین کی صحت میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

لیکن ان کی سچائی پر یقین کی بنیاد آخر پھر کس بات پر ہی؟

اس حقیقت کے سمجھنے کے لیے معاشیات سے کچھ زیادہ واقفیت کی ضرورت نہیں کہ نظریہ قدر کی بنیاد اس تصور پر ہی کہ افراد کے مقاصد اہمیت کے لحاظ سے ایک درجہ پر نہیں ہوتے، ان میں سے بعض کے حصول کو کم اور بعض کی تکمیل کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہی، اور اس اہمیت کے لحاظ سے ان کی ایک ترتیب ممکن ہی۔ اس تصور کے اظہار کے بہت سے ذرائع ہیں کارل منگر اور آسٹرین اسکول کے دوسرے ابتدائی دور کے نمایندوں کے ہاں یہ تصور سیدھے سادے تصور خواہشات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہی۔ وِیسٹیڈ اور شون فیلڈ نے اس تصور کو کچھ اور جلا دی ہی اور ان کے نظریۂ قدر کی بنیاد "اضافی ترجیح" کے تصور پر ہی، بیراڈ، ہکس اور این نے اسی تصور کو اپنے "نظام بے اعتنائی" کے ذریعے واضح کیا ہی، لیکن طرز اظہار کے اس اختلاف کے باوجود اس تصور کی بنیاد اسی بات پر ہی کہ ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مختلف احساسات ہمارے لیے برابر یا کچھ کم و بیش اہمیت رکھتے ہیں اپنے تجربے کی اس بہت ہی معمولی بات سے ہم بہت سی دوسری باتیں اخذ کر سکتے ہیں، مثلاً مختلف اہمیتوں کے تصور سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہی کہ ہم ایک چیز کو دوسری چیز کے بدلے میں قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کیوں کہ اس سے ہماری مسرت میں اضافہ ہوگا، اور اس طرح یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہی کہ ہمارے پاس جو مختلف چیزیں ہوں گی، اُن

سے ہم مختلف ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اس طرح کام لیں گے کہ کوئی غیر اہم ضرورت کسی اہم ضرورت کی تکمیل میں مخل نہ ہو اسی طرح ہم باہم مبادلہ میں اسی حد تک حصہ لیں گے، جب تک کہ کوئی لین دین ہماری مجموعی آسودگی میں اضافہ کرے، پھر اس کے بعد ہم مبادلے سے دست کش ہو جائیں گے۔ جب ہم افراد کے کردار سے آگے بڑھ کر بازار کے مسائل سے بحث کرتے ہیں تو ہم اور دوسرے ثانوی قسم کے مفروضات کی مدد لیتے ہیں مثلاً دو یا اس سے زیادہ آدمیوں کی موجودگی فرض کرتے ہیں، رسد کی مختلف شکلوں میں سے کسی ایک کو سامنے رکھتے ہیں کہ رسد ایک اجارہ کے ہاتھ میں ہو یا بہت سے لوگوں کے ہاتھ میں، بازار کے مختلف حصوں میں ہر حصہ کے حالات کا لوگوں کو علم ہی نہیں، بازار میں قانوناً فلاں فلاں طرح کی خرید و فروخت ممنوع ہو وغیرہ۔ ہم دولت کی ایک خاص طرح سے تقسیم بھی فرض کرتے ہیں۔ لیکن سب حالتوں میں مرکزی تصور وہی رہتا ہو کہ مختلف افراد مختلف اشیا کو مختلف اہمیت دیتے ہیں، اور یہ تصور جیسا کہ اوپر ہم نے دیکھا ہی، ان بنیادی شرطوں میں سے ایک ہی جس کے بغیر کوئی معاشی عمل ممکن نہیں ہی۔ ایسے کردار کا تصور جس کا ایک معاشی پہلو بھی ہو اس مفروضہ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

اب تک ہم نے جن مسائل سے بحث کی ہی، اُن کا تعلق موجودہ اشیا کی قیمتوں کے تعین سے ہی، نظریۂ قدر اور

مبادلے کی ابتدائی بحثوں میں پیداوار کے تسلسل کے قیام کے مسائل سے کوئی بحث نہیں کی جاتی، لیکن اگر ہم پیداوار دولت کے مسائل کو بھی زیر بحث لائیں تو نئی طرح کے سوالات سامنے آتے ہیں، جن کی تشریح کے لیے دوسرے قسم کے اصولوں کی مدد ناگزیر ہی مثلاً ہمیں اس مسئلے کی تشریح کرنی ضروری ہوتی ہی کہ مختلف پیداوار کی قیمت اور ذرائع پیداوار کی قیمتوں میں کیا تعلق ہی جن سے ان چیزوں کے پیدا کرنے میں مدد لی جاتی ہی۔ ان سوالات کے حل پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی سچائی کا دارومدار کن باتوں پر ہی۔

داخلی تعین قدر" کے اصولوں کے ساتھ ساتھ جن سے نظریۂ قدر اور مبادلے کے نسبتاً محدود مسائل کی تشریح میں کام لیا جاتا ہی، ان مسائل کے حل کرنے میں جس نظریے سے سب سے زیادہ کام اور مدد لی جاتی ہی وہ "گھٹتے حاصل کا قانون" ہی اور یہ قانون دراصل صرف اتنی سی بات کا اظہار کرتا ہی کہ مختلف ذرائع پیداوار ایک دوسرے کی جگہ پوری کامیابی سے استعمال نہیں کیے جا سکتے یا وہ ایک دوسرے کا پورا پورا بدل نہیں ہیں۔ زمین کے ایک متعین رقبے پر کام کرنے کے لیے اگر آپ مزدوروں کی تعداد بڑھا دیں تو اس سے پیداوار میں تو اضافہ ضرور ہوگا لیکن یہ اضافہ بڑھی ہوی مقدار محنت کے تناسب سے نہیں ہوگا۔ اگر آپ پیداوار میں دُگنے کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور زمین اور محنت دونوں کی مقدار میں

اضافہ نہیں کرتے تو اِن کو ان دونوں عناصر پیداوار میں سے کسی ایک کی مقدار میں دُگنے سے زیادہ کا اضافہ کرنا ہوگا، یہ بات تو کھلی ہوئی ہے، کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ساری دنیا کے لیے غلہ ایک ایک پر ہی پیدا کر لیا جاتا۔ یہ بات ہمارے بنیادی تصورات کی روشنی میں بھی واضح ہو جاتی ہے کم یاب عناصر کی ایک تقسیم وہ ہے جس میں سب ایک دوسرے کے بدل کا پورا کام دے سکتے ہیں، یعنی مختلف عناصر میں جو فرق ہے اسے ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں، کہ وہ ایک دوسرے کے کامیاب بدل نہیں ہیں، اس طرح "گھٹتے حاصل کا قانون" دراصل اس تصور کا ایک لازمی نتیجہ ہے کہ کم یاب عناصر کی ایک سے زیادہ قسمیں ہیں، اسی طرح یہ ضمنی تصور بھی کہ مخصوص حدوں کے اندر حاصل میں اضافہ ہو سکتا ہے، اس تصور کا براہ راست نتیجہ ہے کہ عناصر پیداوار ناقابل تقسیم ہیں۔ ان اصولوں کی بنیاد پر اور چند ثانوی قسم کے مفروضات کی مدد سے پیداوار دولت کے توازن کا ایک نظری تصور کیا جا سکتا ہے۔

اب آئیے ذرا ان مسائل سے بحث کریں جو نسبتاً زیادہ حرکت پذیر ہیں۔ منافع کو اگر ہم اس کے محدود معنی میں جو آج کل زیادہ رائج ہو گیا ہے استعمال کریں تو نظریۂ منافع اس بات کو سمجھانے کی کوشش ہے کہ مستقبل میں کم یاب ذرائع اور کم یاب اشیا کی دستیابی پر غیر یقینی حالات کے اثرات کیا ہوں گے

ایک کوشش ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہماری مطلوب چیز ہی کم یاب نہیں، بلکہ یہ بھی شبہ اور قیاس کی بات ہے کہ واقعی وہ کس وقت دست یاب ہو سکے گی، مستقبل کے متعلق خاکے بناتے وقت ہم "یقینی باتوں میں سے ایک کا انتخاب نہیں کرتے، بلکہ ہمارا انتخاب تخمینی امکانات کی بنیاد پر ہوتا ہے"۔ ظاہر ہے امکانات کے مدارج میں بھی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں، اور اس لیے نہ صرف ہمیں مختلف غیر یقینی باتوں میں بلکہ اس عدم یقین کے مدارج کے لحاظ سے بھی انتخاب کرنا پڑتا ہے، اسی طرح کے تصورات سے "حرکت پذیر معاشیات" کے جانے کتنے ہی مسائل اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح ہم معاشیات کے کتنے ہی قوانین کا ماخذ اپنے تصور معاشیات کی بنیادی باتوں میں تلاش کر سکتے ہیں مثلاً ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ زر کا استعمال بالواسطہ مبادلے کا نتیجہ ہے اور زر کی طلب مستقبل کے متعلق اسی طرح کے عدم اعتماد کا نتیجہ جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ سرمایہ اور سود کے نظری مسائل بھی اسی طرح کے ابتدائی تصورات سے ماخوذ ہیں، لیکن اس بحث کو طول دینے کی چنداں ضرورت نہیں، جن مثالوں سے ہم اوپر بحث کر چکے ہیں، انھی سے وہ حل مل جاتا ہے جس کی ہمیں تلاش ہے، نظری معاشیات کے قوانین، تمام سائنٹفک نظریوں کی طرح بعض اصول موضوعہ

سے مستنبط ہوتے ہیں، اور استدلال کی ان مفروضہ بنیادوں میں سے اہم ترین اصول سبھی تجربے کی معمولی اور ناقابل انکار باتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ عملی زندگی میں اشیا کی کم یابی کن شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے، یہی چیز معاشیات کے سب ہی قوانین کا آخری ماخذ ہے، نظریۂ قدر کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ افراد اپنی پسند کی چیزوں کو اہمیت کے لحاظ سے ایک درجہ واری ترتیب دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں۔ نظریۂ پیداوار دولت کی سب بحثوں کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ عناصر پیداوار تعداد میں ایک سے زیادہ ہیں۔

نظریۂ حرکت پزیری کے مسائل کی بنیاد استدلال یہ ہے کہ ہم مستقبل کی قلت اشیاء کے متعلق کوئی قطعی اور ناطق فیصلہ نہیں کر سکتے، یہ اصول موضوعہ ایسے نہیں جن کی ماہیت سمجھ لینے کے بعد ان سے انکار کیا جا سکے کہ زندگی میں ان کی کوئی مثالیں نہیں ملتیں، ان کی صحت ثابت کرنے کے لیئے ہمیں کسی لیبوریٹری میں "تجربات" کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ ہماری روزمرہ زندگی کی وہ حقیقتیں ہیں، جنھیں بیان کر دینا ہی تائید حاصل کرنے کے لیے کافی ہے، بلکہ اندیشہ ہے تو یہ کہ ان کا اس قدر واضح اور کھلا ہوا ہونا یہ غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث نہ بنجائے کہ ان حقائق پر غور و فکر کرکے ان سے کسی اہم نتائج کا استنباط ممکن نہیں، لیکن اعلا تحلیل کے سبھی پیچیدہ کلیے دراصل اسی قسم کے مفروضات پر مبنی ہیں، اور عملی زندگی میں ان مفروضہ

شرائط کا موجود ہونا ہی معاشیات کے اہم ترین کلیات کے عام اطلاق کا ضامن ہے۔

۳۔ یہ بے شک صحیح ہے کہ معاشیات کے پیچیدہ مسائل میں جب ہم ان تصورات سے کام لیتے ہیں تو ہمیں بازار کے حالات، مبادلے میں شرکت کرنے والی جماعتوں کی تعداد، قانون ماحول، اشیائے مقدار کا انتخاب جو خریدنے اور بیچنے والوں کے کردار پر اثر ڈال سکتی ہے۔ اور اس طرح کے مسائل کے متعلق ثانوی قسم کے مفروضات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور استدلال کی اِس عمارت کی مضبوطی کا دار و مدار اس پر ہوتا ہے کہ مفروضات میں باہم کوئی منطقی تضاد نہ ہو، اور اس طرح کے اخذ کیے ہوئے نتائج کا کسی مخصوص صورت حال پر اطلاق اس پر منحصر ہوتا ہے کہ اس صورت حال میں مفروضہ شرائط کا وجود ہے یا نہیں، رسد کی ایک متعین شکل پر نظریۂ اجارہ کا اطلاق ہوگا یا نظریۂ مقابلہ کا، یہ سوال علاحدہ غور کا محتاج ہے۔ جس طرح ہم دوسرے علوم کے قوانین کے اطلاق سے پہلے یہ معلوم کرتے ہیں کہ مسئلے کی نوعیت کے لحاظ سے کیا ایک مخصوص صورت حال کی ایک خاص قانون کی تابع ہو بھی سکتی ہے۔ اسی طرح ہمیں معاشی اصول سے کام لینے سے پہلے مسئلہ زیر بحث کی نوعیت اور ماہیت کا تعین کر لینا چاہیے۔ ہم یہ فرض نہیں کرسکتے کہ اجارہ یا مقابلے کی مختلف شکلوں میں کسی ایک کو ہر وقت لازماً موجود رہنا چاہیے اور اس لیے جہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ پیچیدہ تر نظری مسائل

حل کرنے میں ہم کتنے ثانوی مفروضات سے مدد لیتے ہیں وہیں ہمیں یہ بھی پتہ لگانے کی کوشش کرنا چاہیے کہ کسی مسئلے کے حل کرنے میں جن مفروضات کا سہارا لیا گیا ہے خود اُن کے اطلاق کی حدود کیا ہیں، اور جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے ہمارے اہم ترین مفروضات ان تمام حالات میں حقیقت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں جو معاشی مسائل کی تخلیق کا باعث ہیں۔

یورپ کے بعض ممالک میں بعض اوقات اس غلط خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ معاشیات کے قوانین "اضافیت زمانی (یا تاریخی) کے پابند ہیں یعنی یہ کہ ان کے اطلاق کا دائرہ چند تاریخی حالات تک محدود ہے اور ان کے باہر سماجی مسائل کی تشریح میں معاشیات سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

یہ خیال بڑی غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور اوپر کی بحث کی روشنی میں اس خیال کی غلطی آسانی سے واضح ہو جانی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ معاشیات کے یقیناً وسیع قوانین کو دیے ہوئے مسائل کی تشریح کے لیے نتیجہ خیز طور پر ہم اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں کہ کچھ ثانوی قسم کے مفروضات سے کام لیں۔ یہ مفروضات بسا اوقات بالکل جائز طریقے پر ایک "اضافیت تاریخی" کے حامل کہے جا سکتے ہیں، اور یہ یقینی ہے کہ اگر ہم ان ثانوی مفروضات کی مدد نہ لیں گے تو ہم سے بڑی فاش غلطیاں سرزد ہوں گی، لیکن یہ ہرگز صحیح نہیں کہ اسی طرح بنیادی مفروضات بھی قیودِ زمانی سے بَری نہیں۔ بیشک ان کی بنیاد

تجربے پر ہی، اور وہ ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہیں. لیکن جس تجربے پر ان بنیادی مفروضات کی بنیاد رکھی گئی ہی وہ اتنا وسیع ہی کہ یہ مفروضات قیود زمانی کے پابند ثانوی مفروضات سے کہیں بلند حیثیت رکھتے ہیں، کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ افراد کی ترجیح اشیا کے مختلف مدارج ہوتے ہیں یا یہ کہ ذرائع پیداوار کی کئی قسمیں نہیں ہیں اور مستقبل میں ہونے والی مختلف باتوں کے متعلق عدم تیقن کے مختلف مدارج نہیں ہو سکتے ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہی کہ ان مفروضات کے منطقی رتبہ کے بیان کرتے ہیں اختلاف رائے ہو، نہ کوئی شخص جس نے ان مفروضات سے مستنبط مسائل کی نوعیت کا غور سے مطالعہ کیا ہی، ان بنیادوں پر آغاز بحث کے فوائد سے انکار کرسکتا ہی، ان مفروضات سے اخذ کیے ہوئے مفید نتائج سے واقفیت یا ثانوی قسم کے مفروضات پر ہی ساری توجہ کردینا، انھی دو حالتوں میں یہ کہنا ممکن ہی کہ معاشیات کے قوانین بعض مخصوص مقامات پر اور بعض مخصوص زمانوں میں صحیح ہیں، اور ان کی اہمیت محض تاریخی ہی۔ اس نظریے کا مقصد اگر صرف اتنا ہو کہ کسی مسئلے کے حل کرنے میں عام تحلیل کے ساتھ ساتھ ایسے ثانوی قسم کے مفروضات کی مدد لینا بھی ضروری ہی جو اس دیے ہوئے مسئلے سے گہرا تعلق رکھتے ہوں اور اُن کی عمومیت بنیادی مفروضات سے نسبتاً کم ہو تو یہ بڑی اچھی بات ہی، اور

ہر ایک استاد جس نے اپنے اچھے طالب علموں کو نظریات کے الجھاؤ میں خود کو کھو دیتے ہوئے دیکھا ہوگا، اُسے اس نقطۂ نظر سے ہمدردی ہوگی، بلکہ یہ تسلیم کر لینا بھی ممکن ہے کہ تاریخی اسکول کے نسبتاً اچھے نمایندوں نے کلاسیکل معاشیئین کی جو تنقیدیں کی ہیں ممکن ہے ان میں اتنی سچائی کو بھی کبھی دخل رہا ہو، لیکن اگر ایک معاشی تحلیل کے طریقوں کے متعلق بحثوں کی طرح اس کا بھی منشا یہ ہو کہ عام تحلیل سے ماخوذ عام نتائج کا دائرہ اطلاق بھی محض چند مخصوص حالات تک محدود ہے — یعنی کہ معاشیات کے کلیات کا اطلاق صرف انگلستان کے حدود کے اندر اور ملکہ وکٹوریا کے زمانے میں ہی نتیجہ بخش ہو سکتا تھا وغیرہ —— تو یہ ایک بالکل گمراہ کن نظریہ ہے۔ ایک معنی میں تو شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ تمام سائنٹفک معلومات کی افادیت قیود زمانی کی پابند ہے۔ کسی اور زندگی میں شاید یہ سب بے کار ہو جائیں گی، لیکن اگر ایسا ہے تو "اضافیت زمانی" کے حامل علوم کے بیان کرنے کے لیے ہمیں نئے الفاظ کی ضرورت ہے، اسی طرح اگر معاشی کلّیات قیود زمانی کے پابند ہیں تو ہمیں ان مباحث سے تعلق رکھنے والے علوم کے لیے جو کسی خاص وقت یا خاص جگہ سے تعلق رکھتے ہیں ایک نئی اصطلاح کی ضرورت ہے۔

ہم معاشیات کی بنیادی ماہیت کو اگر اس بحث کی روشنی میں دیکھیں تو سینیر اور کیرنس کے زمانے سے اب تک مروجہ نظریے کی صداقت کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجایش باقی

نہیں رہتی، اور یہ بات واقعی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نظریے کی مخالفت میں کوئی ہنگامہ کیوں اٹھایا گیا، کیسے کسی نے اس کی مخالفت کی، اور اگر اس مباحثے کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ "قدیم" نظریے پر جو حملے کیے گیے ان کی بنیاد سائینٹفک یا فلسفیانہ نظریات پر کبھی نہ تھی۔ ممکن ہے کبھی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کسی خاص مورخ سے کسی ادنا درجے کے ماہر معاشیات کا کوئی بے تکا استدلال نہ دیکھا گیا ہو — یا معاشیات کے کسی نظریے کو غلط طور پر کسی تاجر یا سیاسی لیڈر نے پیش کیا ہو — یا کبھی ایسا ہوا ہو کہ کسی منطقی آدمی کو یہ بات پسند نہ آئی ہو کہ فلسفیانہ اصطلاحوں کو غیر محتاط طریقے سے استعمال کیا جائے، لیکن اعتراضات عام طور پر ان حلقوں کی طرف سے نہیں آئے، بیشتر حملوں کا منبع تو سیاسی مصلحتیں تھیں۔ اُن لوگوں نے جنھیں اپنے ذاتی مقاصد حاصل کرنے تھے — یا جن کی راہ میں زندگی کے معاشی مسائل میں بھی قوانین کی پابندی روک بن سکتی تھی، کیوں کہ یہ قوانین ان کے مجوزہ اقدامات کو غیر دانش مندانہ ثابت کرتے تھے انھوں نے سب سے زیادہ ترجوش سے علمِ بغاوت اٹھایا، کم سے کم دبستان تاریخ کے نوجوان نمایندوں کے حملے کا سبب تو یہی تھا، یہ لوگ بسمارک کے زمانے میں بین الاقوامی آزاد خیال کے سب سے سخت دشمن تھے۔ اور آج بھی ان نسبتاً گم نام اسکولوں کے متعلق یہ خیال صحیح ہے جو اس قسم کے نظریات کے حامی ہیں۔ "ادارہ پرستی (Institutionalism) اور "تاریخیت"

میں فرق صرف اتنا ہی کہ موخر الذکر نظریے کہیں زیادہ دل چسپ تھے۔

۴۔ اگر ہماری دلیل صحیح ہی تو فرڈ کے قول کے مطابق معاشیات مختلف حالات میں انتخاب کی ضرورت کے نتائج کی تشریح کا نام ہی۔ نظری میکانک میں ہم اشیا کی اندرونی خصوصیات کے نتائج سے بحث کرتے ہیں۔ نظری معاشیات کے مطالعے میں ہم ایسے کم یاب ذرائع کے جو مختلف کاموں میں لگائے جا سکتے ہیں وجود کے نتائج سے بحث کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہی، ترجیح کے مختلف مدارج کے تسلیم کر لینے سے ہی آگے کے تمام پیچیدہ مسائل وجود میں آتے ہیں۔

اب بھی بعض اوقات لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "اضافی تعین قدر" کے اس نظریے کی بنیاد بعض نفسیاتی اصولوں کی صحت پر ہی۔ ایسے لوگ جو ٹھیک طرح سوچنے کی محنت کی صلاحیت نہیں رکھتے معاشیات کے متعلق مسائل میں خواہ مخواہ غیر متعلق باتوں کو لاکر پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں۔ معاشیات کے فرضی نفسیاتی مفروضات پر حملے اس کی ایک مثال ہیں۔ علم نفسیات تیزی سے ترقی کر رہا ہی اور اس لیے اگر معاشیات کی بنیاد کچھ نفسیاتی اصولوں پر ہی تو اس سے زیادہ آسان کام اور کیا ہو سکتا ہی کہ ہر پانچ سال بعد یہ دکھانے کے بعد کہ نفسیاتی تصورات تیزی سے بدل رہے ہیں اس ضرورت کو تیز و تند الفاظ میں واضح کر دیا جائے کہ معاشیات کے سارے اصول از سر نو تعمیر ہونے چاہئیں

اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں لوگوں نے تساہل سے کام نہیں لیا ہے۔ معاشیات کے طالب علموں نے اس حماقت کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان کے سامنے نئی حقیقتیں دریافت کرنے کا زیادہ دلچسپ اور تسکین بخش کام موجود تھا اور عوام نے جنھیں قلت کی موجودگی میں ایک خواہش کی آسودگی کو دوسری خواہش کی آسودگی پر قربان کرنے کی ضرورت سے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہے خود کو اس غلط فہمی کا شکار ہو جانے دیا ہے کہ معاشیات کے قوانین جن کو نفسیاتی مفروضات سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا پہاڑوں کو اب بھی بحث کا موضوع ہیں، اور اُن کے متعلق اب بھی ہر سمجھدار آدمی کو کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے۔

بدقسمتی سے ماضی میں خود معاشیین کے غیر محتاط طرزِ گفتگو نے اس قسم کے اعتراضات کے لیے بہانہ فراہم کر دیا ہے، جیساکہ عام طور پر معلوم ہے، موجودہ داخلی نظریہ قدر کے بعض مصنفین نے نفسیاتی حظ پرستی کو اپنی دلیلوں کے لیے وجہ جواز کے طور پر پیش کیا تھا، لیکن آسٹرین اسکول نے اس سے اپنا دامن آلودہ نہیں کیا۔ ابتدا ہی سے منگر نے نفسیاتی جھگڑوں سے اپنے کو محفوظ رکھا، اور بوہم باورک نے علانیہ نفسیاتی حظ پرستی سے کسی تعلق سے قطعی انکار کیا، بلکہ اس نے تو اس طرح کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے خاص طور سے کوششیں کیں، لیکن گوسن، جیوانس، ایج ورتھ، وغیرہ لائق معاشیین نے یقیناً اسی طرح

کے غلط نظریے کی آڑلی ہی۔ گوسن نے اپنی کتاب میں حظ پرستی کے اصول کو اپنی بحث کا نقطۂ آغاز بنایا ہی۔ جی وانس نے بھی اپنی کتاب "نظری معاشیات" میں نظریۂ قدر کی تشریح سے پہلے راحت وغم کے نظریے سے بحث کی ہی اور ایج ورتھ نے اپنی کتاب "حسابی طبیعات" کی ابتدا ایک باب سے کی ہی جس میں انسان کو ایک "راحت کی مشین" کا لقب عطا کیا گیا ہی، اس کی بھی کوششیں کی گئی ہیں کہ گھٹتے افادہ کے قانون کو بہر فتہ قانون کا ایک حصہ ثابت کیا جائے۔

ممکن ہی وقتاً فوقتاً ماہرین معاشیات نے اعتراضات رفع کرنے کی کوشش میں کچھ غلط باتیں کہ دی ہوں، لیکن ہمیں تو یہ دیکھنا چاہیے کہ عملاً ماہرین معاشیات نے کن منطقی دلیلوں سے کام لیا ہی اور کن مفروضات کو اپنی بحث کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہی۔

سچ تو یہ ہی کہ ان دونوں باتوں میں امتیاز قایم رکھنا بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہی۔ لیکن معاشیات کے ناقدین نے اسی اہم امتیاز کو قطعاً فراموش کر دیا ہی۔ انھوں نے عمارت کے بیرونی حصہ کا تو بڑے غیر معمولی شوق سے معائنہ کیا ہی، لیکن اس کے اندرونی حصوں کی ساخت کو سمجھنے کے لیے جس ذہنی محنت کی ضرورت ہی اس سے بری طرح جی چُرایا ہی نہ ان بزرگوں نے نظری معاشیات پر اعتراض کرنے سے پہلے جدید تعمیری کوششوں سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت سمجھی ہی۔ بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہی

کہ کوئی شخص جسے موجودہ نظریۂ قدر سے کچھ واقفیت ہو ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نفسیاتی حظ پرستی یا اسی طرح کے کسی اور تصور سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ نفسیاتی بنیادوں پر معاشیات کے معترضین نے اگر یہ باتیں سامنے رکھی ہوتیں تو ان پر یہ بات عیاں ہو جاتی کہ جیوانس وغیرہ کی تحریروں میں لذتیت کے جو آثار پائے جاتے ہیں وہ نظریۂ قدر کے لیے لابدی یا لازمی نہیں، اور جیسا کہ آسٹرین اسکول نے کر دکھایا اسے نظریۂ لذتیت سے کسی قسم کی مدد لیے بغیر ٹھیک ثابت کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس تصور کا بنیادی مفروضہ تو صرف اتنا ہے کہ مختلف چیزیں مختلف استعمال میں لائی جا سکتی ہیں اور یہ مختلف استعمال آسودگی کے لحاظ سے مختلف اہمیت رکھتے ہیں اور اس لیے بعض دیے ہوئے حالات میں ان اشیا کے ایک استعمال کو دوسرے استعمال پر ترجیح دی جاتی ہے، بعض چیزوں کو انسان اس طرح کم و بیش اہمیت کیوں دیتا ہے؟ اس سوال سے ہم بحث نہیں کرتے، اس سوال کا تعلق بیشک نفسیات کے ماہرین یا شاید علم الابدان کے ماہرین سے بھی ہے۔ مختلف امکانات کی موجودگی ہمارے عمل کے لیے مختلف اہمیت کے محرکات مہیا کرتی ہے، اور ان محرکات کو اضافی اہمیت کے لحاظ سے ایک درجہ واری ترتیب دی جا سکتی ہے، اور اس بنیادی تصور سے ہم مختلف اصول اخذ کر سکتے ہیں جن کی مدد سے جماعتی افعال کے کتنے ہی ایسے پہلوؤں کی تشریح کی جا سکتی ہے جو اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے سمجھائے نہیں جا سکتے۔ لیکن ان کی تشریح کی صلاحیت کچھ متعین نفسیاتی اصولوں

کے تسلیم کر لینے کا نتیجہ نہیں۔ معاشیات میں تو ہم ان مسائل کو جن کی تشریح و توضیح نفسیات کا کام ہے اپنی بحث کے لیے مقدمے کی حیثیت دیتے ہیں اور اس طرح معاشیات کے بانیین نے ایسے اصول وضع کر لیے ہیں جن کے اطلاق کی ہمہ گیری کا انھیں شاید خود وہم بھی نہ ہوا ہو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود یہ طرز عمل کہاں تک جائز ہے؟ اوپر کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ تحلیلی معاشیات کے اصول اگرچہ کسی متعین نفسیاتی تصور پر مبنی نہیں ہیں پھر بھی ان تصورات میں بلاشبہ کچھ ایسے عناصر کی آمیزش ضرور ہے جو نفسیاتی ہیں۔ بعض صورتوں میں تو ان کی موجودگی خود ناموں میں تسلیم کر لی گئی ہے — مثلاً موجودہ نظریۂ قدر کو نفسیاتی یا اضافی کی صفتیں دی جاتی ہیں اور اس نظریے کی تعبیر افراد کے ردعمل کی بنیادوں پر ہے جو ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔[۱]

ادھر کچھ عرصے سے کچھ تو کرداریت کے اثر کی وجہ سے اور کچھ اس خواہش کے زیر اثر کہ تحلیلی تفسیر کو زیادہ سے زیادہ "پاک" ہونا چاہیے، اس بات کی کوششیں کی گئی ہیں کہ داخلیت کے اس ڈھانچے کو مسمار کر دینا چاہیے۔ کہا گیا ہے کہ سائنٹفک طریقوں کی پیروی کرنے کا تقاضا ہے کہ ہم ایسے تمام تصورات کا سہارا لینے سے انکار کر دیں جو ہمارے مشاہدے میں نہیں آسکتے۔ طلب کو تو بلاشبہ ہم سامنے رکھ سکتے ہیں کیوں کہ طلب کا اظہار ایسی شکلوں میں ہوتا ہے، جن کا ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں، لیکن اس سے

آگے ہمیں نہیں جانا چاہیے۔ قیمتوں کا تعین ایک داخلی فعل ہے اور اس داخلی فعل کا مشاہدہ ممکن نہیں۔ اس لیے کسی مسئلے کی سائنٹفک توضیح میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں، نظری تشریح میں ہمیں صرف مشاہدے پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً پروفیسر کیسل کا یہی خیال ہے اور پرٹو کی تحریروں میں بھی ایسے جملے ملتے ہیں، جن سے یہی مراد لی جاسکتی ہے۔ یہ رویّہ ان ماہرین معاشیات کی تحریروں میں تو بہت نمایاں ہے، جو کرداری (Behaviourist) نظریۂ نفسیات کے زیر اثر آگئے ہیں یا جن کو اس عجیب وغریب تصور کے ترجمانوں کے حملوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔

بہ ظاہر یہ نظریہ بہت معقول نظر آتا ہے، یہ دلیل کہ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو مادی علوم کی تشریح وتوضیح میں کام میں نہیں لائے جاتے بہ ظاہر بہت ہی قوی معلوم ہوتی ہے لیکن کیا یہ واقعی مناسب بھی ہے؟ آخر ہمارا کام کردار کے بعض پہلوؤں کو سمجھنا اور ان کی تشریح کرنا ہے، اور بغیر نفسیاتی تصورات کے سہارے کے ہم اپنے اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے ہیں، تحلیل کی درستی یا اس کو بیش از بیش سائنٹفک بنانے کی خواہش کو ممکن ہے اس بات سے ٹھیس لگے۔ لیکن اس میں کسی شبے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی کہ ہم انتخاب، بے تعلقی، ترجیح اور اس طرح کے دوسرے الفاظ سے جو داخلی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں، مانوس ہیں اور ان سے ایک مفہوم ضرور ہمارے دماغ میں آتا ہے، مقصد کے تصور کا تعین جو معاشیات

کے لیے ایک بنیادی تصور ہی، محض بیرونی کردار کے تصور سے نہیں ہوسکتا۔ لاتعداد مقاصد اور قلیل المقدار ذرائع کی موجودگی میں اگر ہمیں ان کے باہمی تعلقات کی وضاحت کرنی ہی تو اس کا تقریبًا نصف حل ہمیں نفسیاتی تصورات کی مدد سے ہی مل سکے گا۔

اگر ہم معاشیات کے اس تصوّر کو صحیح تسلیم کرلیں جو اس مقالے میں پیش کیا گیا ہی تو یہ گفتگو قطعی فیصلہ کن ہی اور اس کے بعد اوپر کی غلط فہمیوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، لیکن یہاں یہ کہا جا سکتا ہی کہ یہ زیر بحث نظریہ خود ایک اہم سبب ہی کہ ہم معاشیات کا موضوع صِرف ان خارجی مسائل کو سمجھیں جن کا مشاہدہ ممکن ہی، مثلاً بازار میں مروجہ قیمتیں، تبادلے کی شرحیں وغیرہ پروفیسر کیسل نے جس طریقے کی حمایت کی ہی وہ بالکل یہی ہی، لیکن اگر ہم معاشیات کے موضوع کو ایسے مسایل کی تشریح تک ہی محدود سمجھیں جو ہمارے مشاہدے میں آسکتے ہیں جیسے قیمتیں وغیرہ تو بھی ہم پائیں گے کہ بغیر کچھ داخلی یا نفسیاتی تصورات کے سہارے ان کا حل کرنا بھی ناممکن ہی، قیمتوں کے تعین کا سب سے پہلا مسئلہ یہی تو ہی کہ لوگ قیمتوں کے مستقبل کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، لوگوں کی طلب کا انحصار پروفیسر کیسل کے تصور کے بالکل خلاف محض اس پر نہیں ہوتا کہ بروقت بازار میں کون سی قیمتیں

رائج ہیں بلکہ اس پر بھی کہ مستقبل میں مختلف اشیا کی قیمتوں کا رخ کیا ہوگا۔ فرض کیجیے کچھ چیزوں کی قیمتوں کے متعلق یہ خیال پیدا ہو جائے کہ مستقبل قریب ہیں ان کی قیمتیں گریں گی تو لوگ ان کی طلب کو کچھ دنوں کے لیے ٹالنے کی کوشش کریں گے، اسی طرح اگر قیمتوں کے بڑھنے کا امکان ہو تو کچھ لوگ اس متوقع اضافے سے ضرور فائدہ اٹھانے کے لیے بروقت خریدیں اضافہ کریں گے۔ اور ظاہر ہے "محض کرداری" طریقوں کی مدد سے مستقبل کے متعلق لوگوں کی توقعات یا اندیشوں کو ناپنا ممکن نہیں، حالاں کہ جیسا کہ پروفیسر نائٹ اور دوسرے اور مصنفین نے زور دیا ہے۔

اگر ہم معاشی تبدیلیوں کو کماحقہ سمجھنا چاہتے ہیں تو یہ انتہائی ضروری ہے کہ ان اندیشوں اور توقعات کے اثرات کا بھی جائزہ لیں، یہی نہیں بلکہ آزاد مقابلے کی موجودگی میں قیمتوں کے تعین کی مکمل تشریح کے لیے یہ انتہائی ضروری اور اجارہ کے تحت قیمتوں کے تعین کی توضیح کے لیے قطعاً ناگزیر ہے۔ مستقبل کے متعلق ان اندازوں کو افراد کے "ترجیحی معیاروں" کے تصور کی مدد سے ہم آسانی سے بیان کر سکتے ہیں، لیکن اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اس مسئلے میں ہم صرف مشاہدہ میں آنے والے ہی تصورات سے مدد لیتے ہیں تو یہ سخت غلطی ہے۔ مستقبل میں کیا ہوگا، نہ جانے لوگ اس سوال کا کیا جواب اپنے دماغ میں سوچتے ہیں ہم اسے دیکھ کیسے سکتے ہیں۔

پس اگر ہم معاشیات کے طالب علم کی حیثیت سے اپنے فرائض پورا کرنے چاہتے ہیں، اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان مسائل کی ایک تشفی بخش تشریح کریں جو معاشیات کی کسی بھی تعریف کے ماننے سے ہمیں حل کرتے ہیں۔ تو ہمیں اپنے مطالعے میں لازماً نفسیاتی عناصر کو جگہ دینی پڑے گی، کیوں کہ بغیر ان کی مدد کے ہم کوئی اطمینان بخش حل دریافت نہیں کر سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ معاشری علوم کے ایک بہت ہی ترقی یافتہ حصّے کے ایک مرکزی سوال کا حل ڈھونڈھنے میں ہمیں معاشری اور طبیعی علوم کے درمیان امتیاز کا ایک معیار ہاتھ آگیا ہے۔ علوم کی تحقیق کے لئے ان نسبتاً پیچیدہ مسائل کا مطالعہ کرنا اس مقالے کا مقصد نہیں، لیکن اگر یہ مثال ایک معیاری مثال ہے —— اور بہت سے لوگ قیمتوں کے تعین کے طریقوں کو طبیعی علوم کے طریقوں سے بے حد قریب خیال کرتے ہیں، تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ معاشری علوم کے مطالعے میں جن کا تعلق انسانی کردار کی توضیح کرنا ہو اور اس سے مفید نتائج اخذ کیے جا سکیں تو پوری طرح محض ان ہی طریقوں سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ جو علوم طبیعات میں مفید ثابت ہو چکے ہیں۔ انتخاب مقصد و منہاج کا باہمی تعلق اور اس طرح کے دوسرے تصورات کو جو معاشیات کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں محض خارجی مفروضات کی ہی مدد سے سمجھنا ممکن نہیں

یا مقصد کردار کے اس تصور کا یہ لازمی نتیجہ نہیں کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ انسانی کردار قطعی غیر متعین ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ ان کی تشریح میں ایسے اسباب کو دخل ہے جو نفسیاتی ہیں اور اس لیے مشاہدے کی حدود سے باہر یہ تسلیم کرلینے سے یہ منشا ہرگز نہیں کہ میکس ویبر کے تصور "معروضی" سے ہم دست بردار ہو جاتے ہیں، کیوں کہ ویبر کے نزدیک "معروضی تشریح" کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ ہم ان کی باتوں کو بھی سامنے رکھیں جو محض نفسیاتی نہیں ہیں۔ یہ بات کہ یہ مفروضات قدروں کے متعلق فیصلوں کی نوعیت رکھتے ہیں۔ اسے لازم نہیں بنادیتی کہ ہم انھیں اسی حیثیت سے اہم سمجھیں، معاشری علوم کے مقصد کے لیے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ چیزوں کی اہمیت کے بارے میں کوئی رائے صحیح ہو یا غلط، ان کے لیے تو صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ کیا اس طرح لوگ اشیا کی اہمیت متعین کرتے ہیں، اور کیا اس مفروضہ کو تشریح اسباب میں کوئی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اور اگر اس حصہ کی دلیلیں جو ہم نے پیش کی ہیں، صحیح ہیں تو اس سوال کا جواب اثبات میں ہوگا۔ معاشیات کے مقصد کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

۵۔ لیکن اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ معاشی کلیات کی بنیاد "اضافی ترجیح" کے اس بنیادی مفروضے پر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کیا ان کا انحصار ایک اور نسبتاً وسیع نفسیاتی مفروضے پر نہیں ہے؟ کیا معاشیات یہ فرض نہیں کر لیتی کہ لوگ اپنے افعال میں پوری طرح سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں؟ کیا معاشیات کے

موضوع کو ہم اس طرح بیان نہیں کر سکتے کہ معاشیات نام ہی اشیا کو سوچ سمجھکر استعمال کرنے کے علم کا، اور اس معنے میں کیا یہ کہنا صحیح نہیں کہ معاشیات کا دار و مدار ایک ایسے نفسیاتی مفروضہ پر ہی، جو ان تمام مفروضات کے مقابلے میں بہت ہی نزاعی مسئلہ ہی، جن سے ابھی تک ہمیں واسطہ پڑا ہی؟ یہ ایک ذرا پیچیدہ سوال ہی اور ضروری ہی کہ اس پر کچھ توجہ دی جائے، کچھ تو خود اس سوال کا جواب تلاش کر لینے کے لیے اور کچھ اس لیے بھی کہ اس توضیح سے معاشیات میں تشریح اور تحلیل کے طریقوں پر روشنی پڑتی ہی۔

عقلیت یا سوچ سمجھ کر کام کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہی کہ یہ عمل اخلاقی حیثیت سے جائز اور مناسب ہو۔ اس مفہوم میں تو عقلیت معاشی تحلیل کے مفروضات میں شامل نہیں کیوں کہ جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا ہی معاشیات اس معاملے میں غیر جانب دار ہی۔ افراد کن چیزوں کو کیا اہمیت دیتے ہیں، معاشیات بس اسی سے تعلق رکھتی ہی۔ یہ مزید سوال کہ مختلف اشیا کی یہ مختلف اہمیت خود ایک پسندیدہ بات ہی یا نہیں معاشیات کی تحقیق کے دائرے سے باہر ہی، اور اس لیے اگر عقلیت اخلاقی جواز یا عدم جواز کے مرادف ہی تو یہ تصور معاشی تفتیش کا موضوع نہیں ہی۔

لیکن سوچ سمجھ کر کام کرنے کا ایک اور مطلب یہ بھی ہی کہ مختلف اقدامات ایک دوسرے کے متضاد نہ ہوں، ہم آہنگ ہوں۔ اس معنی میں یہ تصور بعض تحلیلی مسائل میں ضرور معاون ہی،

مثلاً اس مشہور کلیے میں کہ توازن کی حالت میں تقسیم ہونے والی اشیا کی اضافی اہمیت ان کی قیمتوں کے مساوی ہوتی ہے یہ مفروضہ کیا جاتا ہے کہ ہر آخری انتخاب ایک دوسرے سے اس معنی میں ہم آہنگ ہے کہ اگر میں الف کو ب پر ترجیح دیتا ہوں اور ب کو س پر تو میں الف کو بھی س پر ترجیح دیتا ہوں۔ مختصراً اس مفروضہ کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ توازن کی حالت میں مختلف اشیا کو ایک دوسرے کی جگہ بدل کر کچھ فائدہ اٹھانے کا امکان باقی نہیں رہتا۔

اس معنی میں عقلیت کا تصور توازن کے شرائط کی بحثوں میں ایک اور طرح شامل سمجھا جا سکتا ہے۔ مختلف مقاصد کو اس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش خود بے سمجھی کی بات ہو سکتی ہے اگر اس وقت وقت اور توجہ کا کوئی اور اچھا استعمال سامنے ہو، یعنی مختلف اشیا کو ایک دوسرے کی جگہ بدلنے کی کوشش میں وقت کا استعمال کچھ اور موقع کے کھو دینے کا باعث ہو سکتا ہے۔ اور نقصان اس تبدیلی کے متوقع فوائد سے ممکن ہے زیادہ ہو کسی چیز کے حدی افادہ کی فکر نہ کرنے کا حدی افادہ کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ داخلی نظریۂ قدر کے مفسرین نے بوہم بارک کے زمانے سے ہی اسے اپنی تحقیق کا جز سمجھا ہے اور افراد کی پسند میں تھوڑے سے تضاد کی گنجائش رکھکر ہم اسے آسانی سے اپنی بحثوں میں سامنے رکھ سکتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ معقولیت کا یہ تصور اس طرح کے سوالات کا ایک اہم جز ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کہ معاشی کلیات سے صرف ایسے

ہی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں جہاں لوگ سمجھ بوجھ کر کام کرتے ہیں۔ مقاصد اگر ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ ہوں، تو بھی اُن کے حصول کے لیے ذرائع کم یاب ہو سکتے ہیں، مبادلہ، پیداوار دولت اور قیمتوں میں تبدیلیاں — یہ سبھی باتیں ایک ایسی دنیا میں ہوتی رہتی ہیں جہاں لوگوں کو اپنے افعال کے سارے نتائج کی خبر نہیں ہوتی۔ صارفین دولت کی طلب اشیا کو زیادہ سے زیادہ حد تک پورا کرنے اور اس کے ساتھ ہی بیرون ملک سے اشیا کی در آمد کے بند کرنے کی کوششیں ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں، لیکن محصولوں اور اس طرح کی دوسری رکاوٹوں کے پیدا کیے ہوئے ان نتائج کی تشریح معاشیات کے دائرہ تفتیش سے باہر نہیں؛

معقولیت کا ایک مفہوم تو بیشک ایسا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ تھوڑی بہت معقولیت کے بغیر تو کردار میں کوئی معاشی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، اور وہ مفہوم یہ ہے کہ معقولیت کو کسی مقصد کے پیش نظر عمل کرنے کے مرادف سمجھ لیا جائے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہ آئے ہیں اگر کردار کو کسی مقصد کے تحت نہ سمجھا جائے تو مقصد و منہاج کے رشتہ کا وجود ہی ممکن نہیں، اور یہی تعلقات معاشی تفتیش کا موضوع ہیں، پس اس معنی میں اگر انسانی عمل کا کوئی مقصد نہ ہو تو گویا معاشی مسائل کا تصور بھی ممکن نہیں رہ جاتا، لیکن اس مفہوم کا صحیح تسلیم کر لینا بھی یہ معنی نہیں رکھتا کہ تمام انسانی کردار کو لازمًا ہم پوری طرح ہم آہنگ بھی مان لیتے ہیں۔ یہ کہنا بیشک صحیح ہو گا کہ لوگ اگر اپنے مقاصد

کے نتائج سے کماحقہ واقف ہو جائیں تو مختلف مقاصد کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم شروع ہی سے یہ فرض کرلیں کہ افراد کے مقاصد لازماً ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں یا یہ کہ معاشی کلیات کا اطلاق اس مختصر سے قطعۂ زمین پر محدود ہو کے رہ گیا ہے جہاں سے تمام تضاد مٹایا جاچکا ہے۔

حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ مکمل معقولیت اس معنی میں کہ مختلف مقاصد میں باہم کوئی تضاد نہ رہ جائے، نفسیاتی مفروضات میں سے صرف ایک ہے جس سے ہم معاشی تحلیل میں واقعیت کا رنگ پیدا کرنے کے لیے مختلف مواقع پر کام لیتے ہیں۔ اسی طرح مستقبل کے متعلق صحیح پیش بینی کی خصوصیت بھی اسی قسم کا ایک مفروضہ ہے۔ جو بعض اوقات مسائل کے حل کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ ان مفروضات کا مقصد یہ یقین پیدا کرنا نہیں ہوتا کہ عملی زندگی بالکل ایسی ہی ہے جیسی کہ ان مفروضات کی مدد سے نظر آتی ہے بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس طرح ہم ایک ایک کرکے ان رجحانات کے نتائج سے واقفیت حاصل کرلیں جو عملی زندگی میں بہ یک وقت کارفرما نظر آتے ہیں اور پھر اس علم کے بعد مقابلہ اور مماثلت کی مدد سے عملی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کریں اور اس معاملے میں تو معاشیات کا عمل انھی اصولوں پر ہے جو مادی علوم میں رائج ہیں۔ خصوصاً ان علوم میں جو مواد کی فراہمی اور ترتیب کی حدود سے آگے بڑھ کر مفید نتائج اخذ کرنے کی کوشش

بھی کرنے لگے ہیں۔

۶۔ اس گفتگو کی روشنی میں اب ہم اس الزام کا بھی جواب دے سکتے ہیں، جو اکثر کیا جاتا ہے کہ معاشیات کی دنیا "معاشی" انسانوں کی دنیا ہے جس میں روپیہ کمانے اور خود غرضی کے علاوہ کسی اور چیز کو دخل نہیں ہے۔ کسی واقف کار معاشیات کے طالب علم کے لیے تو یہ ایک بہت ہی احمقانہ اعتراض ہے لیکن پھر بھی ہمیں اس پر کچھ وقت صرف کرنا مناسب ہوگا۔ یہ اعتراض تو یقیناً غلط ہے۔ لیکن تحلیل مسائل میں ایک تشریحی طریقۂ عمل سے اس طرح کے اعتراضات کے لیے گنجایش پیدا ہو سکتی ہے خصوصاً اگر اس کی تفصیل سے وضاحت نہ کر دی جائے۔

اوپر کی بحث سے اس یقین کی غلطی تو ضرور واضح ہو چکی ہوگی کہ معاشیات کی دنیا میں بسنے والے افراد یا تو خود غرض ہوتے ہیں، یا محض عیش کوش۔ معاشی تحلیل کا بنیادی مفروضہ تو "اضافی قدروں" کا تصور ہے، اور جیسا کہ ہم اوپر کہ آئے ہیں، ہم یہ تو فرض کر لیتے ہیں کہ مختلف صورتوں میں اور مختلف افراد کے لیے مختلف اشیا مختلف اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ہماری بحث کا موضوع یہ نہیں ہے کہ کوئی متعین اہمیت کسی خاص چیز کے حصے میں کیوں آتی ہے۔ ہماری بحث اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے۔ مختلف افراد چاہے خود غرضی کے پیکر ہوں، یا ایثار کا نمونہ، صوفی منش ہوں یا رنگ رلیوں کے دھنی، یا ان تمام خصوصیات کا ملا جلا نمونہ، ان سب کا کردار بالکل یکساں طور سے معاشیات کا موضوع ہیں۔ اضافی قدروں کے

معیار کا تصور انسان کی بعض مستقل خصوصیات کے اظہار کا محض ایک صوری ذریعہ ہیں، اس تصور کی اہمیت اور سچائی سے انکار کرنے کے معنی ہیں کہ ہم معاشیات کے پچھلے ۶۰ سال کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ر

لیکن دین میں کسی ایک سودے کا تعین مختلف اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر میں روٹی خریدوں تو اس خرید سے میرا مقصد صرف اتنا بھی ہو سکتا ہے کہ روٹی اور دوسری چیزوں کی خرید میں جن پر میں اپنا روپیہ صرف کر سکتا تھا، مجھے روٹی زیادہ اہم معلوم ہوئی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے اور نانبائی کے درمیان ایسے تعلقات ہو سکتے ہیں، جن کی بنا پر میں اس کے ہاں سے روٹی خریدنا زیادہ پسند کرتا ہوں باوجود اس کے کہ ایک اور دکان پر بھی روٹی نسبتاً سستی مل سکتی ہے۔ اسی طرح اپنی محنت فروخت کرنے یا اپنی کسی چیز کو کرایے پر اٹھانے میں بھی میرے پیش نظر محض اتنی سی بات ہو سکتی ہے کہ اس طرح میرے ہاتھ میں کچھ پیسے آجائیں گے جنھیں میں چاہوں خرچ کر سکتا ہوں، اور یہ بھی کہ میں ایک کام کرنے میں زیادہ راحت محسوس کرتا ہوں بہ نسبت کسی اور کام کے اگرچہ مالی معاوضہ مختلف ہو، ایک کام میں مجھے عزت ملتی ہے یا اس علم سے ایک روحانی سکون ملتا ہے کہ جو کام میں کر رہا ہوں اچھا ہے، یہ دونوں باتیں زیادہ مالی منفعت والے کام میں ممکن ہے مجھے نہ مل رہی ہوں۔ اسی طرح کے مختلف نتایج کا خیال کر کے آخرکار افراد ایک متعین فیصلے پر پہنچتے ہیں، اور ایک چیز کو دوسری چیز پر

ترجیح دیتے ہیں۔ معاشیات کو جن مسائل کی تحقیق سے واسطہ ہو وہ اس کے بعد پیدا ہوتے ہیں، لیکن معاشیات ان تمام مسائل کا لحاظ رکھتی ہے اور معاشی توازن کو بیان کرنے والے کلیات کو ایسے الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے، جو اس حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں، آدم اسمتھ کے زمانے ہی سے کسی متعین درجہ کی محنت کی تقسیم میں توازن کی شرط یہ نہیں سمجھی گئی ہے کہ اس طرح ہر مزدور کو زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ پہنچے گا، بلکہ یہ کہ ہر مزدور جب وہ کام چن لے گا جس میں مختلف امکانات کی موجودگی میں اسے سب سے زیادہ فائدہ (اور اس میں بہت سی اور باتیں شامل ہیں) پہنچے تو پھر مزدور ایک کام سے دوسرے کام میں جانے پر عام حالات میں آمادہ نہیں ہوں گے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سرمایے کے بازار میں اندیشوں کا اثر اسی طرح کے مفروضات پر مبنی ہے۔ لیکن بعض اوقات محض مسائل کی توضیح کے لیے ابتدا اس ابتدائی مسئلہ سے کی جاتی ہے کہ تعین قیمت بہت ہی سیدھے سادے حالات میں عمل میں آتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو وہ چیز ہوتی ہے جو خریدی یا بیچی جا رہی ہے اور دوسری طرف وہ مالی معاوضہ جو اس طرح حاصل ہونے والا ہے۔ بعض بہت ہی پیچیدہ مسائل مثلاً نظریہ صرف یا حدی پیداوار کے مسائل کی تشریح میں اس طریق کار سے بہت سی اصطلاحوں کی وجہ سے جو گڑبڑ پیدا ہو جاتی اس سے نجات مل جاتی ہے اور مناسب مقام پر ان مفروضات کو ترک کر کے بہت ہی عام الفاظ میں ان مسائل کی تشریح کچھ بھی دشوار نہیں رہتی۔

بعض اوقات مبادلے کے بعض مسائل کی تشریح میں اس مفروضہ سے کام لیا جاتا ہے کہ گویا سارے مقاصد ایک طرف ہیں اور سارے ذرائع ایک طرف، مثلاً اگر اِن حالات کے ظاہر کرنے کے لیے جن کی موجودگی میں ایک متعین بازار میں ایک ہی قیمت رائج رہ سکتی ہے اگر اس مفروضہ سے کام لیا جائے کہ آپ اپنی ساری خرید اُس دکان سے کرتے ہیں جو سب سے سستا سامان فراہم کر رہی ہو تو اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ آپ خود غرض یا مطلب پرست ہیں۔ اس کے برعکس ہم تو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس طرح کے تعلقات میں پوری "لاشخصیت" کارفرما ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثال کسی وقف کے متولین کی اپنی زیر اہتمام ریاست کے لیے بہترین معاوضے حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ اس مفروضے کا مقصد تو محض اتنا ہے کہ سوداگر سے میرے تعلقات کیسے اور کیا ہیں یہ سوال میرے مقاصد کا جز نہیں ہے۔ میرے لیے (خواہ میں ایک فرد کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں یا اپنے دوستوں کی طرف سے، کسی شہری ادارے کی طرف سے یا کسی خیراتی ادارے کی طرف سے) ان کی حیثیت ذرائع کی ہے، یا اگر یہ فرض کر لیا جائے —— جیسا کہ عام طور پر اس مقصد کے تحت کہ تضاد کے ذریعے یہ بتلایا جا سکے کہ توازن کی شکل میں مختلف اثرات آخر کار کیا صورت حال پیدا کرتے ہیں —— آپ اپنی محنت کے لیے بیش از بیش قیمت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم یہ فرض نہیں کر لیتے کہ آپ کے پیش نظر محض مالی منفعت ہی ہے —— ممکن ہے

آپ کسی بڑے اچھے کام کے لیے روپے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جو کچھ بحث کے نقطۂ آغاز کے طور پر ہم واقعی فرض کرتے ہیں وہ تو محض یہ ہے کہ جہاں تک اس سودے کا تعلق ہے میری محنت محض ایک ذریعہ ہے خود مقصد نہیں۔

اگر یہ بات کہ "معاشی انسان" کا تصور مسائل کی تشریح میں صرف سہولت کے خیال سے اختیار کیا گیا ہے —— ایک ایسا تصور جس سے دلیلوں کی تفصیل کی ابتدائی منزلوں میں بہت ہی بچ بچ کر کام لیا جاتا ہے۔ اور جسے نتائج کی حمایت کے لیے باقی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی —— عام طور پر سمجھ لی گئی ہوتی تو شاید یہ تصور اس طرح بدنام نہ ہوتا۔ لیکن عام خیال تو یہ ہے کہ اس تصور کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے کہ بغیر اس کی مدد کے طلب اور رسد سے متعلق سارے کلیات کچھ بے کار سے ہو جاتے ہیں اور چوں کہ ان کلیات کا مطلب اس تکلیف دہ حقیقت کا اظہار ہے کہ آپ اگر چاہیں کہ اپنے کیک کو دیکھ کر بھی خوشی حاصل کریں اور کھائیں بھی تو یہ ناممکن ہے اس لیے اس تصور کو جسے ان قوانین کی تہ میں غلطی سے کارفرما سمجھا گیا ہے بڑے ہی شد و مد سے اعتراضات کا ہدف بننا پڑا ہے۔ مسرت اور افراط کی دنیا میں داخلہ اگر اس بدبخت "معاشی انسان" کے تصور کے تسلیم کرنے ہی کی وجہ سے بند ہو گیا ہے تو پھر تھوڑی سی نفسیات سے واقفیت اس تصور کے شیرازے کو پراگندہ کر سکتی ہے، اور اگر ایسا کیا جا سکے تو انسانی فطرت کی گہرائیوں تک پہنچنے میں دقت نظر کا یہ کتنا عظیم الشان کارنامہ ہوگا اور کتنا باوقار!

بدقسمتی سے اس تعین کی بنیاد ایک غلط فہمی پر ہے، معاشی تبدیلیوں کے نظری کلیات کی بنیاد اس مفروضے پر ہرگز نہیں کہ افراد کے عمل کے محرکات صرف مالی منفعت یا مالی نقصان ہی ہیں ہم تو بس صرف اتنا مانتے ہیں کہ مختلف امکانات کو کم یا زیادہ ضروری ٹھیرانے میں ان محرکات کو بھی کچھ دخل ہے۔ اور یہ کلیات تو بس اتنا ہی کہتے ہیں کہ اگر کسب مال کے محرک میں کوئی مناسب تبدیلی ہوئی تو اس سے مختلف حصوں کی اہمیت میں پھر تبدیلی ہو جائے گی۔ ممکن ہے کسی مخصوص صورت حال میں روپے کو غالب اہمیت حاصل نہ ہو لیکن اگر اسے کچھ بھی اہمیت حاصل ہو تو یہ کلیات اس حال پر پوری طرح چسپاں ہوں گے۔

آئیے ایک مثال کے ذریعے اس مسئلے کو پوری طرح صاف کرلیں، فرض کیجئے آزاد مقابلے کے حالات میں ایک مخصوص چیز کی پیداوار کے لیے حکومت کی طرف سے کوئی امداد دی جائے۔ تو معاشیات کے بہت ہی معروف اصولوں کے مطابق اس چیز کی پیداوار کی مقدار میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اس کلیے کی بنیاد کن تصورات پر ہے؟ کیا اس تصور پر کہ اس چیز کے پیدا کرنے والوں کے نزدیک صرف پیسے کو اہمیت حاصل ہے؟ بالکل نہیں۔ ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ انھوں نے ان تمام "فوائد اور نقصانات" کو سامنے رکھا ہے، جن سے ایڈم اسمتھ اور کینٹلان نے ہمیں بخوبی آگاہ کر دیا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ اس امداد سے پہلے توازن کی کیفیت موجود تھی تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس امداد سے لازماً توازن میں فرق

آ جائے گا۔ اس امداد کی وجہ سے کاروبار کی اس مد میں حقیقی آمدنی کا حصول نسبتاً آسان ہوگیا ہے۔ اور یہ معاشیات کا ایک بہت ہی معمولی اصول ہے کہ اگر قیمت میں کوئی کمی ہو جائے تو طلب میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس نتیجے میں ذرا ایک موشگافی کی بھی ضرورت ہے، یہ ممکن ہے کہ اگر مفروضہ تبدیلی بہت ہی معمولی ہو تو پیداوار کی اس مد پر کوئی اثر نہ پڑے جس میں یہ تبدیلی شروع ہوئی ہے۔ کیا یہ ہمارے نظریے سے متضاد بات ہے؟ ایسا نہیں، ترجیحی ترتیب اشیاء کے تصور کا یہ منشا نہیں کہ ہر چیز کی مقدار میں ہر اضافہ خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو انسانی مزاج کے لیے ضرور کوئی اہمیت رکھتا ہے ممکنات کی بہت سی شکلوں کی موجودگی فرض کر لیتے ہوئے بھی ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کسی تبدیلی کے موثر ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ مقدار ایک متعین وزن رکھتی ہو۔ ایک پیسہ دو پیسے کے فرق سے ممکن ہے کسی فرد کی عادتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہی فرق اگر آنوں تک پہنچ جائے تب بھی کوئی اثر نہیں ڈالے گا۔ نہ اس سے یہ مطلب ہے کہ اگر ذرائع محدود ہوں تو کسی ایک چیز پر زیادہ خرچ کرنے کا لازمی نتیجہ تقسیم ذرائع پر کوئی اثر نہیں ڈالے گا گو یہ ضرور ممکن ہے کہ پیداوار کی اس متعین شکل میں جس پر یہ تبدیلی براہ راست اثر انداز ہوگی، مطلوبہ مقدار میں کوئی کمی نہ آئے۔

۷۔ اس بحث کی روشنی میں معاشی تحلیل کی ماہیت اب واضح ہو جانی چاہیے۔ معاشیات مشتمل ہے ایسے نتائج پر جو کچھ مفروضات

کی مدد سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے وہ مفروضات جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ کم و بیش عالم گیر حقیقتیں ہیں۔ جہاں کہیں بھی انسانی کردار کا ایک معاشی پہلو ہو۔ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ان کے وجود پر شہادت دے گا۔ دوسرے مفروضات نسبتاً کم عام ہوتے ہیں، اور متعین مسائل کے حل کرنے میں ان سے کام لیا جاتا ہے، وہ ان مسائل کے نسبتاً عام پہلوؤں سے متعلق ہوتے ہیں جنھیں حل کرنے کے لیے اصولوں کی ضرورت ہے۔

بعض اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس طرح کا تصور تو لازماً صرف ایسے مسائل کے حل کرنے میں ہی معاون ہو سکتا ہے جو "ساکن" قسم کے ہوں۔ توازن کی آخری شکل کو تو بیشک ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن تبدیلیاں تو اس کی حدود میں نہ آسکیں گی، اور کہا جاتا ہے کہ چوں کہ دنیا میں توازن کی کیفیت ہمہ وقت موجود نہیں ہوتی بلکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس لیے اس طرح کا علم تشریح مسائل کے لیے بھلا کیا قیمت رکھتا ہے۔ یہ شبہ بہت عام ہے اور اس لیے ضروری ہے کہ اسے رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ معاشی تحلیل کے ابتدائی تصورات تو بلاشبہ "ساکن توازن" کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ ہم ایسے حالات کے مطالعے سے اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں۔ جو بالکل ساکن تو نہیں ہوتے لیکن جن میں مختلف رجحانات اپنے اثرات مکمل کر چکے ہوتے ہیں اور مزید تبدیلیاں ختم ہو چکی ہوتی ہیں یا اگر کچھ تبدیلیاں ہوتی

ہیں تو ان میں ایک طرح کا تواتر پیدا ہو جاتا ہے۔

اس طرح ہم ایک بازار کی مثال لے سکتے ہیں اور یہ فرض کر لینے کے بعد کہ اس بازار میں طلب و رسد کی بنیادی شرطوں میں ایک طرح کا استحکام پیدا ہو چکا ہے پھر یہ پتا لگانے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ اگر بیچنے اور خریدنے والوں کو سودا کرنے کی آزادی حاصل بھی ہو تو کن حالات میں مقدار خرید و فروخت میں تبدیلی نہیں ہوگی یا پیداوار دولت کی مثال لے لیجئے۔ یہاں یہ مان لینے کے بعد کہ پیداوار کی بنیادی شرطوں یعنی افراد کی خواہشات اور فنی امکانات میں یا ذرائع پیداوار میں تبدیلی ہوئے بغیر مختلف اشیا کی پیداوار کی رفتار میں تبدیلی کن حالات میں ہوگی؟ اس طرح کے امکانات کی تفصیل بیان کرنا غیر ضروری ہے، وکس کے خطبات یا والراز کی عناصر معاشیات یا اس طرح کی کسی اور کتاب میں اس طرح کے مباحث کی کافی مثالیں مل جائیں گی۔ لیکن یہ فرض کر لینا غلط ہوگا۔ کہ ہماری تحقیقات کا دائرہ صرف اس طرح کے مسائل تک محدود ہے۔ مختلف رجحانات کے استحکام کی صورت میں مسائل کا اچھی طرح مطالعہ کر لینے اور اس طرح مقابلے کی مدد سے یہ جان لینے کے بعد کہ کن حالات میں ان رجحانات میں تبدیلیاں پیدا ہوں گی، ہم اپنے مطالعے کو مزید وسعت دے سکتے ہیں اور ان مسائل کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں جو تبدیلیوں کے پیدا کردہ ہیں۔

ایسا کرنے کے دو طریقے ہیں۔ اولاً تو مواد میں تھوڑی

بہت تبدیلیاں فرض کر کے ہم توازن کی دو مختلف شکلوں کا باہم مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک ٹیکس کے عائد ہونے سے فنی طریقوں میں تبدیلی یا لوگوں کے مذاق میں تبدیلی سے کیا کیا نتائج پیدا ہوں گے۔ ایسی کسی ایک تبدیلی سے اس سے پہلے کے توازن میں کیا تبدیلی ہو جائے گی۔ اس سوال کا حل دریافت کرنے کی کوشش تبدیلیوں کے مسائل کے سمجھنے کا ایک طریقہ ہے۔ نام نہاد کلاسی کی تحلیل میں جو توازن کی آخری شکلوں کو پوری طرح بیان کرنے کے لیے غیر مکمل ہے اس طرح کے مفید مقابلوں کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ہمارے نظری اصولوں کے اس حصّے کو کبھی کبھی تقابلی سکونیت کا بھی نام دیا جاتا ہے۔

لیکن ہم اس سے بھی ایک قدم آگے جا سکتے ہیں، تھوڑی بہت تبدیلیاں مان کر توازن کی دو آخری شکلوں کا باہم مقابلہ کرنے کے علاوہ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ یہ پتا لگانے کی کوشش کریں کہ اگر معاشی نظام میں کوئی عدم توازن پیدا ہوتا ہے تو اس نظام کے مختلف اجزا کس طرح اثر پذیر ہوتے ہیں۔ مارشل کے نظام میں "وقت" کے طول کے مختلف امکانات کے مطالعے کی اہمیت یہی ہے۔ اسی طرح زر اور بینکنگ کے مسائل میں جو اہم ترین باتیں ہیں اسی زمرے میں آجاتی ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے میں ہمیں یہ تسلیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ آخر میں توازن ضروری ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ معاشی نظام کے مختلف حصوں میں ایسے رجحانات کارفرما ہیں جو متعین صورتوں میں توازن پیدا کرنے کے لیے کوشاں

ہیں۔ مگر ہم یہ ماننے پر مجبور نہیں کہ ان سب کا مشترک اثر توازن کا پیدا کرنا ہی ہوگا۔ اور مواد کی ابتدائی شکلوں کا ایسا تصور جو توازن کے قائم کرنے میں نہیں بلکہ ایک ہی طرف جھکاؤ میں معین ہوں کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مسئلے کی "سکونی" بنیادوں کا علم ضروری ہے، تبدیلیوں کا مطالعہ توازن کے تھوڑے سے اختلافات یا توازن کے مختلف رجحانات کے اثرات کے مطالعے کی مدد سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوچنا مشکل ہے کہ اس کے علاوہ کون سا طریقۂ کار اس سلسلے میں مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہم "سکون" کی ان شکلوں کا مطالعہ اسی لیے کرتے ہیں کہ تبدیلیوں کے پیدا کردہ مسائل کے حل کرنے میں ان سے مدد لے سکیں، معاشی "سکون" کے بعض مسائل بہ ذات خود اہم بھی ہیں اور مفید بھی۔ لیکن یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ان کی سب سے بڑی اہمیت اسی میں ہے کہ ان کی مدد سے معاشی "تغیرات" کے مسائل میں مدد ملتی ہے۔ ہم "ٹھیراؤ" کے قوانین کا مطالعہ اس لیے کرتے ہیں کہ "حرکت" کے قوانین آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ان سب سے بھی آگے نہیں جا سکتے؟ حرکت کے اثرات کا مطالعہ جس کا ہم ذکر کرتے آئے ہیں کیا وہ مواد میں تبدیلیوں کے اثرات کا مطالعہ ہوگا یا عدم توازن کی متعین صورتوں کے انجام کا۔ کیا ہم ان مسائل سے بھی آگے جا کر خود مواد کی تبدیلیوں کی تشریح نہیں کر سکتے۔ اس سوال کے جواب کے لیے ایک علاحدہ باب درکار ہوگا؛

(۵)

معاشی کلّیات اور واقعات کا باہمی تعلّق

سائنٹفک کلیات کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کا تعلق واقعات سے ہوتا ہے۔ خواہ ان کے بیان کی شکل مشروط ہو یا مطلق ــ منطق یا ریاضی کے کلیات کے خلاف، کسی نہ کسی لحاظ سے معاشی کلیات کا تعلق ان حقیقتوں سے ہے جن کا روز مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، یا جن کا وقوع ممکن ہے محض تصوری باتوں سے نہیں۔

اس لحاظ سے معاشیات کے قوانین دوسرے علوم کے قوانین سے ملتے جلتے ہیں، جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، یہ قوانین روز مرہ کے جانے بوجھے حقائق سے متعلق بہت ہی ابتدائی قسم کے مفروضات کی مدد سے اخذ کیے جاتے ہیں اور ظاہر ہے اگر صغرا کبرا کا تعلق واقعات سے ہو تو نتائج کا تعلق بھی حقیقی زندگی کے واقعات سے ہو گا۔

پس ظاہر ہے کہ معاشیات کے ناقدین کا یہ خیال کہ معاشیات فرضی تصورات سے اخذ شدہ نتائج کے مجموعہ کا

نام ہے، جن کا زندگی کی حقیقتوں سے تعلق ہونا ضروری نہیں
غلط ہے۔ یہ تو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ان واقعات سے متعلق ہمارا علم جو معاشی
کلیات کی بنیادیں ہیں، ان واقعات کے علم سے جو فطری علوم کے
اصولوں کی تہ میں ہیں، مختلف اہم امور میں مختلف ہے، اور یہ بھی
تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ کہ اسی وجہ سے معاشیات کا طریق کار فطری
علوم کے طریق کار سے مختلف ہوتا ہے، گو یہ بات ان کی منطقی
یکسانیت کے متعلق صحیح نہیں ہوگی۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ معاشی
کلیات کی اہمیت محض تصوری ہے اور وہ من گھڑت تصورات
سے اخذ کیے ہوئے نتائج ہیں، جن کی نوعیت محض موشگافانہ
ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ معاشی کلیات کے عملی زندگی پر اطلاق
کے متعلق فطری علوم کے کلیات سے زیادہ یقین کے ساتھ
دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں،
بنیادی معاشی کلیات کے بنیادی عناصر ہماری روز مرہ کی جانی بوجھی
باتیں ہیں اس کے برخلاف فطری علوم میں ہم انھیں صرف
نتائج کے طور پر جانتے ہیں۔ افراد کی ترجیحی ترتیب طلب
کے مفروضہ کی عملی زندگی سے مناسبت زیادہ یقینی ہے بہ نسبت
اس تصور کی سچائی کے کہ مادی دنیا میں الکٹران بھی کوئی چیز ہے۔
یہ سچ ہے کہ ہم تعریفوں اور تصورات سے بہت سی باتیں اخذ
کرتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں کہ یہ تصورات من گھڑت
تعریفیں ہوتی ہیں۔

اوپر کی گفتگو سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ یہ خیال

کرنا بھی کہ کوئی ماہر معاشیات خواہ وہ نظری معاشیات سے کتنا ہی زیادہ شغف رکھتا ہو کچھ تصورات سے نتائج کے استنباط کو اپنے مقصد کی منتہا سمجھ بیکتا ہے ایک غلطی ہوگی۔ یہ تو بلاشبہ صحیح ہے کہ اس کے کام کا بیشتر استخراج و استنباط نظریات سے متعلق ہے۔ لیکن یہ غلطی ہے کہ یہی اس کا کل کام ہے یا یہ کہ بنیادی اہمیت انھی کو حاصل ہے۔

ایک ماہر معاشیات کا مقصد حقیقت کی توضیح ہے۔ اور اس حقیقت کے انکشاف کے لیے اسے نہ صرف معلوم مقدمات کی تشریح کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ ان حقائق کی چھان بین بھی اس کے کام کا ایک اہم جزو ہے۔ جن پر ان مقدمات کی بنیادیں ہیں عام تجربے کے ان اجزا کا پتہ لگانا جو ہمارے استخراجی استدلال کی بنیادیں بن سکیں، معاشی تحقیق کا بالکل اتنا ہی اہم جز ہے جتنا کہ پرانے مقدمات سے نئے نتائج ڈھونڈھ نکالنا، موجودہ نظریۂ قدر کی حالیہ ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ سیدھے سادے ابتدائی مقدمات سے نئے نئے نتائج کا استخراج ہوا۔ لیکن منگر کی تحقیق نے جس کی بنا پر اس ترقی کی ابتدا شروع ہوئی وہ خود مقدمات کی دریافت تھی معاشی تجزیہ کی بنیادوں کا علم حاصل کرنا اور ان کا انتخاب معاشیات کا اتنا ہی اہم پہلو ہے، جتنا معاشی تجزیہ خود ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ ان بنیادوں پر ہی معاشی تجزیہ قائم ہے۔

۱۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ جن کلیات کا

ہم نے اب تک ذکر کیا عام اصولوں کی نوعیت رکھتے ہیں۔ اگر کوئی چیز قلیل المقدار ہو تو ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ اس کے صرف کے طریقے متعین قوانین کے تحت ہوں گے، اگر اس کی طلب کی نوعیت ایک خاص طرح کی ہو تو ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ رسد کی تبدیلیوں کے ساتھ قیمت میں تبدیلیاں ایک خاص قسم کی ہوں گی۔ لیکن جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں قلت کے اس تصور میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی بنا پر ہم قلت کو کسی مخصوص چیز کے ساتھ منسوب کر دیں۔

ہمارے اخذ کردہ نتائج ہمیں اس کا حق نہیں دیتے کہ ہم ماہی اچار کو ایک معاشی چیز کا درجہ دے دیں اور خراب گوشت کو ایک غیر ضروری چیز کا۔ اور نہ ہم ان کلیات سے دونوں چیزوں کی طلب کی اضافی کمی یا زیادتی کا استخراج کر سکتے ہیں۔ نظری معاشیات کے نقطۂ نظر سے طلب و رسد کے تعین پر ایک طرف تو افراد کی ذاتی پسند و ناپسند کا اثر پڑتا ہے اور دوسری طرف ان کا دار و مدار معلوم فنی اہلیت پر ہے۔ افراد کی پسند اور فنی معلومات دونوں ہی معاشیات کی حدود سے اس معنی میں باہر ہیں کہ معاشی قوانین ان کے متعلق کوئی پیشین گوئی کرنے سے قاصر ہیں۔ اسٹرگل کی پُر معنی اصطلاح میں معاشی تحلیل و تجزیے کے نقطۂ نظر سے یہ چیزیں ہمارے موضوع بحث کا "غیر منطقی" عنصر ہیں۔

۳۔ لیکن کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم ان حدود سے تجاوز

کر جائیں؟ کیا ہمیں یہ خواہش نہیں کرنی چاہیے کہ "ترجیحی پیمانے کے تصور کو ہم" اعدادی" قیمتیں بھی دے سکیں اور اس طرح طلب و رسد کے اعدادی قوانین بنا سکیں کہ اگر دس گھڑیوں کی طلب ہو تو ان کی قیمت بڑھ کر ۵۰ روپے ہو جائے گی وغیرہ۔ ان سوالات سے پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے جو ہم نے پچھلے باب میں بغیر حل کیے چھوڑ دیا تھا۔

ایسی معلومات اگر حاصل ہو سکتیں تو ان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن اگر ہم ذرا غور کریں تو یہ معلوم ہو جائے گا، کہ ایسے مسائل کی دریافت کی کوشش کرنے میں ہم ایسے مسائل سے دوچار ہوں گے جہاں یہ فرض کرنے کا کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کوئی اصول یا یکسانیت دریافت کر سکتے ہیں، کسی متعین وقت میں افراد کے ترجیحی معیار کی نوعیت نتیجہ ہوتی ہے مختلف النوع اسباب کا اور اس لیے یہ فرض کرنا جائز نہیں کہ ان مختلف النوع اسباب کے پیدا کردہ نتائج زمان و مکان کی قیود سے بالکل آزاد ہمیشہ یکساں ہوں گے۔ ایک طرح تو یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ فطرت کی ہر مثال متعین اسباب کا نتیجہ ہے، لیکن بے ترتیب واقعات کی ایک اٹکل پچو مثال سے کوئی اہم کلیات اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ علوم کا یہ ڈھنگ نہیں اور یہ توقع کہ معاشی تجزیے کی اصطلاحی تقسیموں کو ایسے معنی دیے جا سکتے ہیں، جو مستقل اہمیت کے حامل ہوں۔ ذرا بے معنی سی امید ہے۔ ایک مثال سے ہمارا مفہوم واضح ہو جائے گا۔

ہیرنگ مچھلیوں کی طلب کا سوال لے لیجیے۔ فرض کیجیے ایک فرمان نافذ ہوتا ہے جس کی رو سے ہیرنگ کی قیمت رائج قیمت سے کم کردی جاتی ہے، اگر ہم یہ کہہ سکتے کہ بلینک نے (۸-۱۹۰۷) میں اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کردیا تھا کہ معمولی ہیرنگ کی طلب کی تغیر پذیری کا تناسب ۱۱ اور ۳ کا ہے اس لیے موجودہ حکم کے نفاذ کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مطلوبہ مقدار اور رسد میں ۲ ملین پیسوں کی کمی رہ جائے گی۔ کتنا خوش کن ہے یہ خواب اور اگر یہ پورا ہوسکتا تو دوسرے علوم کے ماہروں کے مقابلے میں ہماری اہمیت کتنی بڑھ جاتی؟ اور پھر بڑے تاجروں پر اس طرح کی معلومات کا کتنا رعب پڑے گا اور عوام ہمارے علم کی اہمیت اور افادیت کے کتنے قابل ہوجائیں گے؟

لیکن کیا یہ قابلِ عمل بھی ہے؟ فرض کر لیجیے کہ ۸-۱۹۰۷ء میں بلینک نے واقعی یہ ثابت کردیا تھا کہ قیمتوں کی مقداریں اگر ایک مخصوص تبدیلی ہو تو طلب کی تبدیلی کا تناسب ۱ اور ۳ کا ہوگا۔ اس طرح کے اندازے عملاً بہت مشکل نہیں ہیں اور بعض مقاصد کے لیے بہت کافی مفید ہوسکتے ہیں، لیکن یہ خیال کرنے کا کیا سبب ہے کہ بلینک نے اس طرح کوئی ایسا قانون معلوم کرلیا ہے جو دائمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہیرنگ مچھلی جسم کی چند ضروریات کو پورا کرتی ہے، اور اگرچہ یہ ضرورتیں دوسرے کھانوں سے بھی پوری ہوسکتی ہیں اور ان ضرورتوں کو ٹھیک ٹھیک بتایا جاسکتا ہے، لیکن ہیرنگ کی طلب کا تعلق محض ضرورت کا

نتیجہ نہیں، اس کا تعین ایک حد تک فیشن پر ہی، اور پھر حرام وحلال کے نئے تصور کے ساتھ اس کی طلب پر بھی اثر پڑ سکتا ہی، ہیرنگ کی طلب میں ایک حد تک اس کا بھی اثر پڑتا ہی۔ کہ دوسری قسموں کے کھانے دستیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں اور ان کی قیمتیں کیا ہوں گی وغیرہ۔ آبادی کی مقدار اور پسند بھی اس سلسلے میں ایک اہم جز ہی۔ آبادی کی آمدنی اور افراد کے مابین تقسیم دولت کا بھی ہیرنگ کی طلب پر اثر پڑے گا۔ اگر نقل وحمل کے اخراجات میں تبدیلی ہو تو ہیرنگ کے بازار کی وسعت میں کمی زیادتی ہو سکتی ہی۔ کھانا پکانے کے نئے طریقے اگر معلوم ہو جائیں تو ان کی طلب پر اثر پڑ سکتا ہی، کیا یہ تسلیم کر لینا ممکن ہی کہ ایک مخصوص بازار میں ہیرنگ کی طلب کی کیفیتوں کا مشاہدہ کر کے ایسے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ جن کا اطلاق زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو، اور وہ دائمی اہمیت کے حامل ہوں، ہاں معاشی تاریخ کی حیثیت سے یہ اطلاعات ضرور اہم ہوں گی۔

یہ ممکن ہی کہ مختلف طریقوں سے ہم مختلف زمانوں کے متعلق اپنے مشاہدات جمع کر سکیں۔ مثلاً بجائے اس کے کہ ہم ہیرنگ کی طلب کا کسی خاص بازار میں چند دنوں کے لیے مطالعہ کریں، ہم قیمتوں کی تبدیلیوں اور طلب و رسد کی تبدیلیوں کے متعلق ایسے اعداد جمع کر لیں جو بہت ہی مختلف زمانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور ان اعداد سے ہیرنگ کی رسد کی

موسمی تبدیلیوں ۔ آبادی کی کمی زیادتی اور اس طرح کے دوسرے اثرات کا لحاظ رکھتے ہوئے طلب کی تبدیلی کا ایک اوسط دریافت کرلیں۔ بعض متعین حدود کے اندر اس طرح اندازے مفید بھی ہیں۔ تاریخ کے اس متعین دور میں اسباب و اثرات کے بیان کرنے کا وہ ایک اچھا ذریعہ ہیں اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔

مستقبل قریب میں طلب کی نوعیت کے متعلق ان سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ مختلف بازاروں میں ہیرنگ کی طلب قیمت سے متاثر ہونے کے اعداد معاشی تجزیے کو زیادہ کار آمد بنانے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ لیکن یہ اعداد اٹل قوانین کی جگہ نہیں لے سکتے۔ ماضی میں ایسا ہوگیا تھا۔ مستقبل قریب میں ممکن ہے کچھ دنوں تک یہی صورت حال باقی رہے۔ لیکن محض ماضی میں ان کا وقوع اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ ایک طرح کے اسباب کا نتیجہ تھا نہ یہ کہ مستقبل کی تبدیلیاں اسی طرح کے اسباب کا نتیجہ ہوں گی جو ماضی میں کار فرما تھے۔ ہیرنگ کی طلب و رسد کے مسائل سے بحث کرنے میں اگر ہم معاونت کرنا چاہیں تو ہمیں بلینک کی تحقیقات پر بھروسا نہیں کرلینا چاہیے۔ بلکہ نئے حالات کے مطابق نئے واقعات کی روشنی میں ہمیں ان نتائج کی پھر سے تحقیق کرنی چاہیے۔ اور اگرچہ اس طرح کی تحقیقات اہم ہیں اور ان کی افادیت سے انکار

ہرگز ہمارا مقصود نہیں لیکن پھر بھی ان نتایجٔ کو فطری علوم کے "اعدادی" قوانین کا رتبہ ہرگز نہیں دیا جاسکتا۔

لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کی تحقیقات کے نتایج اور ان مفروضات سے اخذشدہ نتایجٔ ہیں جن پر معاشیات کے بنیادی قوانین کی بنیاد قائم ہے۔ فرق نوعیت کا نہیں بلکہ کمیت کا ہے۔ یہ کہا جاچکا ہے کہ اگر سب مقاصد یکساں اہمیت رکھتے تو انسانی کردار کے متعلق کوئی فیصلہ ممکن ہی نہ ہوتا۔ اور نظریۂ قدر کے انتہائی ابتدائی اصول بھی بے کار ہو جاتے۔ یہ یقینی نہیں کہ مقاصد ہمیشہ اسی طرح اہمیت کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔ہاں زیادہ امکان یہی ہے کہ ایسے حالات قائم رہیں گے۔ جن کی بنا پر ان اصول کا عملی زندگی کے مسائل پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ایسے حالات کا تصور ناممکن ہے جب کہ طلب کا رجحان قطعیت کے ساتھ معلوم ہو، لیکن اگر ایسا عام طور پر ہوا کرے تو استنباطی نظریوں میں ہی بعض بہت نمایاں نظریات بے محل ہو جائیں گے۔ یہ بھی محض ایک گمان غالب ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ پھر اس مفروضہ میں اور اس دوسرے مفروضہ میں کہ طلب کی تبدیلی کا تناسب ۱-۲ ہوگا نوعیت کا تو کوئی فرق نہیں رہا۔کیوں کہ دونوں مفروضوں کی بنیاد ایک ظن غالب ہی ہے۔

یہ دلیل وزنی ہے اور ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اس

معنوں میں واقعی فرق محض حد یا درجہ کا ہے نوعیت کا نہیں۔
لیکن کمیت کا یہ فرق اتنا بڑا فرق ہے کہ ہم شاید اسے نوعیت کا فرق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ افراد کی پسند اس طرح کی ہو جائے کہ افراد کا کردار غیر متعین اور مبہم ہو جائے۔ لیکن یہ امکان اتنا بعید از قیاس ہے کہ ہم اس کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہ تو اتنا غیر ممکن نہیں کہ طلب کا رجحان قطعی ہو لیکن ظن غالب اب بھی یہی ہے کہ ایسا ہونا استثنا کی حیثیت رکھتا ہے اصول کی نہیں۔ اس کے برخلاف جب ہم متعین اشیا کی قیمت سے بحث کر رہے ہوں اور مختلف قیمتوں کے پیش نظر طلب کی مقدار میں تبدیلی کے کچھ اصول وضع کریں تو ہمیں ان اصولوں کے لیے دوام کی امید نہیں ہو سکتی اور نہ ہونی چاہیے۔

یہ حقیقت کہ ہم اپنی پسند کو اہمیت کے لحاظ سے درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک عام حقیقت ہے اس کے برخلاف کسی خاص وقت افراد کی پسند کی ترتیب کو وہ عمومیت حاصل نہیں اور اس فرق کی بنا پر ہم جائز طور سے اپنی بحثوں میں انھیں رتبہ اور اہمیت کے لحاظ سے زیادہ اور کم بلند درجہ دے سکتے ہیں۔

بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ان ہنگامی قدروں کے تعین کے سلسلے میں قیمتی کام ہوگا۔ لیکن اگر ہم اپنی بحثوں میں تناسب کے زریں اصول کو فراموش نہ کریں

تو ہمیں یہ تسلیم کر لینا ہوگا۔ کہ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ان کی حدود کو اچھی طرح سمجھ لیں بہ جائے اس کے کہ ہم اِن کے ان صوری پہلوؤں پر جو فلسفۂ معاشیات کی نسبتاً وسیع صفاتی بنیادوں سے ملتے جلتے ہیں زور دیں۔ شاید معاشرتی اور علوم طبیعی کے طریق کار کا یہ ایک دوسرا نمایاں فرق ہے۔

طبیعیاتی علوم میں مابینی تصورات سے اعدادی تصورات کی راہ آسان بلکہ ناگزیر ہے۔ اس کے بر خلاف معاشری علوم میں بعض صورتوں میں ایسا کرنا تقریباً ناممکن ہے اور ہمیشہ بہت ہی مشکل اور غلطیوں کے امکانات سے بھرا ہوا۔ اب تک جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس علم کی بنا پر یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ علم کی ان دونوں شاخوں کے اختلافات پر زور دینے سے نقصانات کا اندیشہ ان کی یکسانیت پر زور دینے سے کم ہے۔

۴۔ طلب و رسد جیسے ابتدائی تصورات کو کوئی متعین عددی قیمت دینے کی کوششوں کا جب یہ حال ہے تو اور پیچیدہ مسائل جیسے قیمتوں کی تبدیلیاں، تجارتی مدوجزر وغیرہ کی تبدیلیوں کے" متعین عددی قوانین فراہم کرنے کی کوشش کا حشر معلوم۔ پچھلے دس سال میں اس طرح کی لغو کوششوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور اسے انسٹی ٹیوشنلزم، عددی معاشیات، تغریزیہ معاشیات، جیسے شاندار ناموں سے نوازا گیا ہے۔ لیکن اس طرح کی

تمام نکتہ سنجیاں شروع سے ہی لایعنی تھیں اور اگر ان کے پیچھے وقت نہ گنوایا گیا ہوتا تو کوئی حرج نہ ہوتا۔ نظریہ "امکان" جس پر موجودہ ریاضی کے فن اعداد و شمار کی بنیاد ہے۔ ایسے حالات میں ایک اوسط نکال کر اسے کوئی اہمیت دینے کے لیے کوئی کوئی وجہ جواز نہیں فراہم کرتی جہاں یہ فرض کرنے کا کوئی سبب نہ ہو کہ مختلف قسم کے ہم جنس اسباب یک جا کارفرما ہیں۔ لیکن اس طرح کی کوششوں کا عام رنگ یہی ہے۔ مختلف رجحانات کو جو ایک دوسرے سے بالکل غیر متعلق اور جداگانہ اثرات کا نتیجہ ہیں ایک دوسرے سے متعلق سمجھ کر "اعدادی" قوانین دریافت فرمائے جاتے ہیں۔ زمان و مکان کی یک سر جداگانہ شکلوں میں ہونے والے واقعات سے اوسط نکالے جاتے ہیں اور توقع رکھی جاتی ہے کہ اس نتیجہ کی کوئی اہمیت ہے پروفیسر ویسلی مٹسل کی کتاب "بزنس سائیکلز" کو لے لیجیے۔ بہت ہی قیمتی مواد کی فراہمی کے لیے سبھی معاشیات جاننے والے پروفیسر مذکور کے ممنون ہوں گے۔ لیکن اسی کتاب میں ۱۸ویں صدی کے اواخر سے لے کر آج تک کی تمام معاشی کساد بازاریوں کے مختلف رخوں کے ایک لمبے اور قیمتی بیان کے بعد انھوں نے تمام تجارتی چکروں کے طول کا ایک اوسط نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اور ۱۶۶ مشاہدات کو بہت ہی پیچیدہ ریاضی اصولوں کی مدد سے ایک نقشے میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن آخر اس طرح کی محنت سے کس پھل کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس سے کیا

مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے؟ کون سے نتائج نکالے جا سکتے ہیں؟ یہ مشاہدات مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان مختلف اوقات میں معاشی اداروں کی نوعیت بدلتی رہی ہے۔ ان مختلف زمانوں کے اس مطالعے سے اگر کوئی کام لیا جا سکتا ہے، تو تقابل کا۔ لیکن پروفیسر ویسلی کا جو مروجہ معاشی تجزیے کے طریقوں کو بہت ہی حقیر سمجھتے ہیں، خیال ہے کہ ان ٹیڑھی سیدھی لکیروں کی کوئی اور بھی قیمت ہے یا ان میں کوئی اور بھی اہم بات چھپی ہوئی ہے۔ "اعدادی" معاشیات کے نئے نرالے ڈھنگ کی اس سے زیادہ تحقیر شاید ممکن نہ تھی جو پروفیسر ویسلی کے اس نقشے سے ہوتی ہے۔

ان عظیم الشان کوششوں کی لغویت سے بحث کرنا فضول ہے۔ یہ کوششیں نئی نہیں گو وہ آج کل بہت ہی عزیز ہو گئی ہیں اور پھر ایک ایسی تحریک کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے جو ہمیشہ عملیت کی منطق سے کام لیتی رہی ہے۔ ایک عملی معیار کا استعمال زیادہ بہتر ہے۔ رچرڈ جونس نے کنگس کالج لندن میں اپنے افتتاحیہ خطبہ میں پہلی بار رکارڈو کے نظام معاشیات کی "تصوری" تجرید کے متعلق تقریباً ایک صدی پہلے جب علم بغاوت بلند کیا تو اس نے کم و بیش وہی دلیلیں دی تھیں جو استقرائی طریق کار کے حامی اس وقت سے آج تک دیتے آئے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ "باغی" جماعت خاصی بڑی ہو گئی ہے۔ جسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس زمرہ میں بڑے ماہرین فن، جامعات کے شعبہ ہائے معاشیات کے

کتنے صدر، بڑے بڑے فضلا جن کی لیاقت پر قیصر نے مبارک باد
کے خطوط بھیجے تھے اور بڑی بڑی تحقیق گاہوں کے ذمے دار اصحاب
سبھی شامل ہیں ۔ ...... اب سے پہلے "تاریخی اسکول" کے پیروانِ
کار نے یہ علم بلند رکھا تھا ۔ اور اُن میں ایک دو
مستثنیات کے ساتھ یہ کہنا آسان ہے کہ یہ رائیں جرمن یونیورسٹیوں
میں بہت مقبول تھیں اور گذشتہ چند سال میں اگر یہ خیالات امریکہ
پر چھا نہیں گئے ہیں، تو کم سے کم ان خیالات کے ماننے والوں
کا حلقہ کافی وسیع ہو گیا ہے ۔ لیکن اب تک ایک بھی معاشی
"قانون" جسے واقعی یہ نام دے سکیں، ایک بھی "اعدادی" کلیہ جس
کی اہمیت کو دوام حاصل ہو دریافت نہیں کیا جا سکا، اعداد
و شمار کا ایک اچھا ذخیرہ بعض تاریخی واقعات کے متعلق ایک
دو کتابیں، یہ ہے کل کائنات، لیکن "ٹھوس قانون"، قوانین، یا معاشی
کردار" کی کوئی اہم یکسانیت آج تک معلوم نہیں ہوئی ۔ یہی
نہیں موجودہ فن اعداد و شمار سے معاشی مسائل کی تحقیق میں
مفید کام جس جماعت نے لیا وہ انسٹیٹیوشنلزم کے عَلَم بردار
نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو تجزیہ مسائل کے پرانے طریقوں
کی پیچیدگیوں سے باخبر اور ان کے حامی ہیں اور سو سال
کی محنتِ شاقہ کے بعد آج تاریخ کی سب سے بڑی معاشی
کساد بازاری (۱۹۳۲) کے مسائل کی تنقیح میں ان کے اسلحہ کند
اور ان کی تجویز کی ہوئی تدبیریں لا یعنی ہیں ۔ ان کے معلوم کیے ہوئے
"رجحانات"، نہ جانے کس دنیا میں ظاہر ہو رہے ہیں ۔ اور اسی دوران

ہیں چند خاموش سوچنے والوں نے پرانے طریقوں سے جن کو اس قدر حقیر سمجھا گیا تھا کام لے کر ان تبدیلیوں کے متعلق اتنی معلومات فراہم کر لی ہیں کہ پچھلے چند پُرآشوب سال کے سارے واقعات کی ایک عام تصویر ان کی مدد سے کھینچی جا سکتی ہے۔ اور کساد بازاری کے پریشان کن معمّے کا کوئی مکمل حل آئندہ چند سال میں معلوم ہو جانا کچھ بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

۴۔ لیکن پھر عملی دنیا کے تفصیلی مسائل کے مطالعے کے متعلق معاشیات کا رویہ کیا ہے؟ قلت کی عالم گیری ذرائع پیداوار کے تنوع، مستقبل کے متعلق ناواقفیت، اور اس طرح دوسرے نظریوں کی عملی اہمیت کا یقین حاصل کر لینے کے بعد کیا پھر اس کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ معاشیات کا ایک طالب علم عملی دنیا سے اور بھی کچھ واسطہ رکھے؟

اس سوال کا جواب پُرزور نفی میں ہے۔ اور آدم اسمتھ اور کینٹلان کے زمانے سے اب تک وہ سارے معاشیات کے ماہر جنھوں نے اس علم کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے، عملاً اس نفی کی تائید کرتے رہے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ پرانی روایات کے حاملوں نے حقائق سے احتراز کیا ہو۔ بلکہ ان بزرگوں نے تو منگر کے بہ قول طریق کار کی بحث میں بھی کبھی آغاز کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لی۔ معاشیات ان معاشرتی علوم میں نہیں جہاں مفید نتائج کے اخذ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہو کہ طریق کار

کی بحثوں میں سر کھپایا جائے۔ اور اگر "تاریخی اسکول" کے حامیوں نے اس خواہ مخواہ کی بحث کو چھیڑا نہ ہوتا تو طریق کار کے متعلق بحثیں شاید وجود میں نہ آئی ہوتیں۔ پرانی روایات کے حامیوں کا طریق کار ہمیشہ ہمہ گیر رہا ہے۔ دوسروں کے طریق عمل پر اعتراضات، یا ان کو معاشیات کی حدود سے باہر نکالتے کی کوششیں ہمیشہ دوسری جماعت کی خصوصیات نہیں تحلیل کے حامیوں نے ہمیشہ "واقعات" کے مطالعے کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ اور عملی زندگی کے "واقعات" کی تحقیق کا ڈھنگ معلوم کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس طرح کی اہم ترین کوششوں کا سہرا باغیوں کی کسی جماعت کے سر پر نہیں بلکہ پرانی روایات کے علم برداروں کے ہی سر پر بندھنا چاہئے۔ عملی معاشیات کی تاریخ میں جیوانس، منگر اور بولے کے کارناموں کو اشمولر، وبلن اور ہلٹن کی کوششوں سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ واقعات کی تحقیق جس سے کوئی مفید مقاصد حاصل ہوسکیں انھی سے ممکن ہے جو تجزیہ و تحلیل کے اصولوں سے پوری طرح آشنا ہوں اور جنھیں یہ معلوم ہو کہ ان مطالعوں سے کون سی امیدیں جائز طور پر رکھی جاسکتی ہیں اور کن مسائل کے حل کرنے میں ان سے بہت معمولی مدد حاصل ہوسکتی ہے۔

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ "واقعات" کے مطالعے سے کیا امیدیں جائز طور پر رکھی جاسکتی ہیں۔ ان فوائد کو ہم تین

حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

سب سے کھلا ہوا فائدہ تو یہ ہے کہ ہم اس طرح یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ مختلف نظری اصولوں میں سے کون سا کسی متعین مسئلے کے حل میں مدد دے سکتا ہے۔ کسی نظری اصول کی صحت کا دار و مدار تو اس پر ہے کہ منطقی حیثیت سے وہ ان بنیادی تصورات سے جن کے مفروضہ پر اس کی تعمیر ہوئی اخذ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن کسی متعین مسئلے پر اس کا اطلاق تو اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ سارے تصورات جو اس اصول میں مضمر ہیں ان اثرات کے آئینہ دار ہوں جو بروقت کار فرما ہیں۔ فلت کے اظہار کے مواقع بہت سے اور تغیر پذیر ہیں، اور اگر ان کے بیان میں احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو یہ اندیشہ ہے کہ کسی متعین اصول کو ایسی جگہ بھی کار فرما تصور کر لیا جائے گا جو حقیقتاً اس کی مملکیت سے باہر ہے۔ عملی زندگی میں ایسے مسائل پیش آ سکتے ہیں جو بظاہر کسی ایک خاص اصول کے تحت آتے ہوئے معلوم ہوں لیکن حقیقتاً اس کے حلقۂ اثر سے باہر ہوں۔

ایک معمولی سی مثال سے ہمارا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ نظریۂ زر کے مطابق اگر زر کی مقدار میں اضافہ ہو جائے۔ تو زر کی قیمت میں کمی آ جاتی ہے۔ تجربے کے بہت ہی معمولی واقعات سے یہ اصول اخذ کیا جا سکتا ہے اور اس کی سچائی کے لیے مزید استقرا، یا چھان بین کی ضرورت

نہیں۔ لیکن کسی وقت اس کو عملی زندگی میں کام میں لانے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ کون سی چیزیں زر کے تحت آجاتی ہیں اور کون سی نہیں اور اس سوال کا حل عملی زندگی کی طرف رجوع ہونے سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ زمانے کے ساتھ زر کے مفہوم میں تبدیلی ہوئی ہو۔ اور اس لیے اگر پرانی اصطلاح اور اس کے پرانے مفہوم کی ہی روشنی میں ہم ایک نئے مسئلے کی تحقیق کریں تو ممکن ہے ہم کسی بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔ شاید اس وقت ہم یہ بھی نتیجہ نکال لیں کہ خود یہ نظریہ غلط ہے۔ جیسا کہ اس نظریے کی تاریخ میں اکثر ہوا ہے۔ بینکوں اور شرح مبادلے کے متعلق کرنسی اسکول کی رائیں ان کے حریفوں سے کہیں زیادہ ترجیح کے قابل تھیں۔ لیکن انھیں دائمی قبول کی سند صرف اس لیے حاصل نہ ہو سکی کہ وہ اپنے تصور زر میں بینک کے قرضوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بدلتے ہوئے واقعات کی مستقل چھان بین کی مدد سے ہی ہم اس طرح کی غلط فہمیوں سے بچ سکتے ہیں۔

دوسرے ان مطالعوں سے ان ثانوی مفروضات کی طرف ہدایت ہو سکتی ہے۔ جن کی اہمیت پچھلے باب میں بیان کی گئی ہے۔ معاشی کردار کے مختلف پہلوؤں کا معائنہ کرنے سے ہمیں یہ توقع ہو سکتی ہے کہ اس طرح کے مسائل کی مختلف ایسی شکلیں سامنے آئیں گی جن کی مزید تحقیق و تحلیل مناسب ہوگی۔

ایک بار پھر ہم نظریۂ زر سے ایک مثال لے سکتے ہیں، اجراء نوٹ کے ذمے دار بینکوں کے طریق کار کا مطالعہ کرنے سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ اگر بینک کے پاس سونے یا چاندی کی ایک متعینہ مقدار آجائے تو زر کی مقدار میں اضافے کا دارومدار اس پر ہوگا کہ اس بینک کے لیے سرمایہ زر کے طور پر کتنا سونا رکھنا ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظریۂ زر کی مکمل تشریح و توضیح میں ہمیں مختلف مفروضات سے جو اس طرح کے تمام امکانات کا احاطہ کرلیں کام لینا چاہیے۔ اور یہ ضروری نہیں۔

اجرائے نوٹ کے بینکوں کے فرائض کی نوعیت و ماہیت پر ایک عام نظر ڈالنے سے ہی وہ تمام امکانات سامنے آجائیں عملی زندگی کے گہرے مطالعے سے ہی یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ کون سے مفروضات عملی زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ اور اس لیے قابل استعمال ہیں۔

عملی زندگی کے مسائل کے مطالعے سے متعین اصولوں کے اطلاق کی حدود اور ان ثانوی مفروضات کا ہی جن کی مدد سے ان اصولوں سے ہم مخصوص مسائل کے حل کرنے میں کام لے سکیں، پتہ نہیں چلتا۔ ان سے ہمیں ایسے حلقوں کا بھی پتہ لگتا ہے۔ جہاں نظری اصولوں کی از سر نو تشکیل یا توسیع کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ ان کے مطالعے سے نئے مسائل سامنے آتے ہیں۔

نظری معاشیات اب بھی بعض مسائل کی مکمل توضیح کرنے سے معذور ہے۔ ایسے مسائل کی سب سے اچھی مثال تجارت کا وہ اُتار چڑھاؤ ہے جسے ٹریڈ سائیکل کا نام دیا گیا ہے۔ توازن قیمت کے ابتدائی نظری اصول تجارتی خوش حالی اور معاشی کساد بازاری کی تشریح نہیں کر سکتے۔ اس سے تو صرف ایک ساکن حالت میں معاشی تعلقات کی نوعیت کی تشریح کی جا سکتی ہے۔ اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں مفروضات کی تھوڑی سی توسیع کے بعد اس نظریے سے یہ کام بھی لیا جا سکتا ہے کہ مقدمات کے اختلاف کی شکل میں معاشی تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔ لیکن مزید تشریح و توسیع کے بغیر اس نظریے سے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ ہمارے معاشی نظام میں ایسے کون سے اثرات کار فرما ہیں جو غیر مناسب ترقی یا پھیلاؤ کی طرف لے جاتے ہیں۔ مکمل طلب اور رسد میں فرق کی بھی تشریح اس اصول کی روشنی میں اس معنی میں ممکن نہیں جس معنی میں ”منڈی کے عام قانون“ میں یہ تصورات استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ اس طرح کے تناقض کا وجود ہے۔ اور اس لیے واقعات کی تشریح محض انھی نظریوں کی مدد سے اگر کی جائے تو ایسی باتیں باقی رہ جائیں گی جو معاشی کلیات کی حدود سے باہر ہوں گی۔

عملی زندگی کے مطالعے کے ذریعے بعض کلیات کے ناکافی ہونے کا علم حاصل ہونے کی یہ ایک اچھی مثال ہے، اور شاید عملی زندگی کے مسائل کے مطالعہ کا سب سے بڑا مقصد

اس طرح کی خامیوں کا پتہ لگانا ہی ہو،

نظری ماہرِ معاشیات جو اپنے نظریے کے نتائج کی طرف سے پورا پورا اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہو کہ واقعی مسائل کی تشریح میں وہ اپنے نظریوں کی آزمائش کرتا رہے۔ کیوں کہ واقعی مسائل کے مطالعے کے سلسلے میں ہی نظری اصولوں کی کمزوریوں اور خامیوں کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ عملی زندگی کے ایسے بہت سے مشاہدوں سے جہاں نظری اصولوں اور عملی زندگی کے واقعات میں تناقض ہو خود ان مسائل کے حل بھی معلوم ہو سکتے ہیں، جن کے حل کرنے سے موجودہ نظریات فی الحال قاصر ہیں۔ مشاہدہ کا یہ مقصد نہیں۔ اور "استقرائی بغاوتوں،، کی ساری تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ کہ ان امیدوں کے ساتھ جو نتائج پیش کیے گیے ہیں وہ بالکل ہی بے کار ثابت ہو چکے ہیں۔ ٹریڈ سائیکل کے مسائل کے سلسلے میں تو یہ بات خصوصیت کے ساتھ پیش آئی ہے۔ جب تک ان مسائل کی تحقیق اعداد و شمار اور ریاضی کے چکروں میں پھنسی رہی کوئی اہم دریافت نہ ہو سکی اور اس وقت تک اس سلسلے میں کوئی ترقی شروع نہیں ہوئی جب تک کہ ایسے ماہرین نے یہ کام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا جنھوں نے مسائل کو وہاں سے دیکھنا شروع کیا، جہاں ابتدائی نظری تجزیے کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ اور ابتدائی قسم کے

اُن ماہیتی مفروضات کی مدد سے جن کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تجارتی چکر کی ایک ایسی تشریح کر دی۔ جو نظریۂ توازن کے مفروضات سے ہم آہنگ ہے۔ ہمارے موضوع کی ان دونوں شاخوں کے باہمی تعلقات کی اس سے اچھی مثال نہیں مل سکتی عملی زندگی کے مطالعے سے نئے مسائل سامنے آسکتے ہیں اور پھر جب ان مسائل کے حل معلوم ہو جائیں تو عملی زندگی کے متعلق واقفیت سے اس کا پتہ چل سکتا ہے کہ اس جواب کے اطلاق کی وسعت کیا ہے؟

عملی زندگی کے مسائل پر غور و فکر کرنے سے نئے مفروضات کی طرف ہدایت ہو سکتی ہے۔ جو مزید نظری تشریح کے لیے کار آمد ہوں۔ لیکن حل محض نظری معاشیات کی مدد سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور ان کے باہمی تعلق کو بدل دینے کی کوششوں کا نتیجہ محض یہ ہے کہ بے مقصد مشاہدات کی طول طویل تفصیلیں سپرد قلم کر لی جائیں۔

اور پھر ——— اب ہم اسی نقطے پر واپس آگئے جہاں سے ہماری بحث کا آغاز ہوا تھا ——— یہ فرض کر لینے کا تو کوئی سبب نہیں کہ وہ کلی اصول جو "بچے ہوئے" مسائل کی تشریح کے لیے وضع کیے جائیں عام نہیں ہوں گے۔

نظری تشریح مسائل میں ہم جن تقسیموں سے کام لیتے ہیں انھیں کوئی دوامی عددی اہمیت دے سکنے کی امید جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا ہے۔ کبھی پوری ہوتی نظر نہیں

آتی۔

عملی زندگی کے مسائل کی تحقیق پر اپنے نظری تصورات کو آزما کر، اور باقی ماندہ دقتوں کو پھر نظری طور پر حل کرنے کی کوشش کر کے ہم اپنے علم کی تحلیل کے آلات میں ترقی اور توسیع کی امید تو بجا طور پر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ عملی مسائل کے مطالعے سے ہمیں یہ پتہ چل جائے گا کہ مختلف حالات میں کون سی اشیا معاشی اشیا رہیں گی۔ اور ان کی ٹھیک ٹھیک قیمتیں کیا ہوں گی تو یہ توقع جائز نہیں۔ یہ تسلیم کر لینے سے معاشیات کے کسی حقیقی مسئلے کے حل کرنے میں ہم معذور نہیں ہوں گے۔ مقصد محض اتنا ہے کہ ہم یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہمارے موضوع کی متعین حدود سے کونسی چیزیں باہر ہیں اور کون سی اندر۔ اس تقسیم سے انکار کرنا فضول کی شیخی ہے۔

۵۔ لیکن یہ تسلیم کر لینے سے کہ معاشی قوانین عام اصولوں کی نوعیت رکھتے ہیں۔ یہ لازم نہیں آجاتا کہ ہم ان ناگزیر نتائج کو بھی جن کا یہ قوانین پتہ دیتے ہیں۔ حقیقت سے دور سمجھیں یا ان کلیات کو تشریح مسائل یا مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کے مقاصد کے لیے ناکافی یا غیر اہم تصور کر لیں۔ اس کے برخلاف ان کی ماہیت اور ان کے اطلاق کی حدود کو اس طرح ٹھیک ٹھیک متعین کر لینے کے بعد ان متعین حدود کے اندر ان قوانین کے اٹل ہونے کا زیادہ یقینی دعوے کرنا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

معاشی قوانین ناگزیر نتائج کی توضیح کرتے ہیں۔ دیے ہوئے حالات میں، متعین نتائج کا ظہور پذیر ہونا لازمی ہے۔ اور مفروضہ حالات اگر عملی زندگی میں کسی وقت کارفرما ہوں تو ان کے نتائج یقیناً وہی ہوں گے۔ جن کی ان کلیات کی روشنی میں ہمیں توقع ہونی چاہئے۔ اس مفہوم میں یہ قوانین دوسرے سائنٹفک قوانین کا رتبہ رکھتے ہیں اور انھی کی طرح ان قوانین کی کارکردگی بھی ٹالی نہیں جاسکتی۔ کسی وقت اگر واقعات کی ترتیب ایک خاص قسم کی ہو تو ہم اس سے پورے یقین کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں۔ کہ دوسرے واقعات بھی جن کا یہ ترتیب پتہ دیتی ہے ضرور موجود ہوں گے۔ پچھلے باب کی گفتگو جن لوگوں کی سمجھ میں اچھی طرح آگئی ہوگی انھیں یہ سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔ کہ ایسا کیوں ہے۔ اگر "متعین صورت حال" کی نوعیت ایک خاص قسم کی ہو تو بعض دوسرے پہلو بھی ضرور موجود ہوں گے کیوں کہ ان کی موجودگی ان حالات سے ہی اخذ کی جاسکتی ہے جنھیں بحث کا نقطۂ آغاز یا ابتدائی مفروضہ بنایا گیا ہے۔ توضیحی طریقۂ بحث پیچیدہ واقعات کے ایک ڈھیر سے ناگزیر نتائج کے اخذ کرنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ ایسے نتائج جن کا عملی زندگی میں پتہ لگانا ابتدائی مفروضات کے واقعاتی جواب کا پتہ لگانا ہے ان مفروضات کے تکمیلی اجزا کی طرح آسان نہیں۔ یوں سمجھئے کہ دیے ہوئے مفروضات کے تمام نتائج کو الگ الگ معلوم کرلینے کا یہ ایک آلہ ہے، اگر یہ مفروضات اور حقیقی واقعات

ہم آہنگ ہوں تو ان قوانین کی مدد سے اخذ کردہ نتائج بھی ناگزیر اور اٹل ہوں گے۔

اگر ہم خاکوں کی مدد سے تشریح کے طریقے کو پیش نظر رکھیں تو یہ بحث خصوصیت کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے۔ قیمتوں پر کسی ایک ٹیکس کے لگائے جانے سے کیا نتائج مترتب ہوں گے؟ فرض کیجئے ہم ایک خاکے کے ذریعے یہی نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ طلب کی تغیر پذیری کے متعلق ہم بعض باتیں فرض کر لیتے ہیں، اسی طرح صرف پیداوار کے متعلق بھی اور پھر انھیں ایک گراف کی شکل میں نمایاں کر دیتے ہیں، قیمتوں پر کیا اثرات مترتب ہوں گے۔ کون سی قیمتیں بڑھیں گی، کن قیمتوں میں کمی ہوگی اور کون سی قیمتیں کوئی اثر نہ قبول کریں گی، یہ سب ہم آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ تمام باتیں ابتدائی مفروضات میں ہی چھپی ہوئی ہیں اور ان پوشیدہ پہلوؤں کو گراف نے اجاگر کر دیا ہے۔

معاشی تحلیل کی یہی ناگزیری معاشیات کو پیش بینی کی اہمیت عطا کرنے کا باعث ہے، یہ بات تو ہم پوری طرح واضح کر چکے ہیں کہ معاشیات کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ بس یونہی اٹکل پچو یہ بتا سکے کہ کسی خاص وقت واقعات کی نوعیت کیا ہوگی۔ مختلف اشیا کی اضافی اہمیت کے متعلق معاشیات کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتی، لیکن کسی مخصوص صورت حال میں اگر واقعات کی نوعیت معلوم ہو تو معاشیات عواقب

کے متعلق ناگزیر نتائج اخذ کر سکتی ہے، اور اگر یہ حالات نہ بدلیں تو معاشیات کی مدد سے اخذ کردہ نتائج بھی اٹل ہوں گے اور قطعاً غیر مبدل۔

یہاں واقعات کے مطالعے کی اہمیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ ایسے مطالعے سے ان بدلتے ہوئے حالات کا پتہ لگ سکتا ہے۔ جنکی مدد سے کوی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے، جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ یہ بڑی غیر ممکن العمل بات نظر آتی ہے کہ اس طرح کے مطالعے سے ان واقعات کی تبدیلی کے قوانین کا پتہ چل سکے، کیوں کہ یہ مقدمے ایک طرح کے اسباب سے یکساں متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن ایسے مطالعوں سے یہ مقصد ضرور حاصل ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاتھ وہ اطلاعات لگ جائیں جن کی مدد متعین حالات میں مفید ہو۔ اس طرح ہمیں یہ پتہ لگ سکتا ہے کہ ان مختلف عناصر کی اضافی اہمیت کیا ہے جو کسی خاص وقت میں کار فرما ہیں۔

مستقبل میں تبدیلی کی نوعیت کے متعلق بھی ان مطالعوں کو ہم مناسب پیشین گوئیوں کی بنیاد بھی بنا سکتے ہیں اور بلاشبہ یہ عملی معاشیات کے مطالعے کا ایک بڑا مقصد ہے۔ عملی معاشیات کا مطالعہ تحلیل کی ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتا نہ اس کا مقصد ایسے مسائل میں تجرباتی قوانین کا استنباط ہے جہاں اس طرح کے قوانین کے وجود کا ہی امکان نہیں، اس کا مقصد تو یہ ہے کہ ایسے واقعات کا علم فراہم کرتی رہے۔ جن کی بنیاد پر

ہم مستقبل کے متعلق پیش بینی کی کوئی عمارت کھڑی کر سکیں۔ عملی زندگی کے مطالعے یہ بتا سکتے ہیں کہ مختلف حالات میں کون سے اصولوں کا اطلاق موزوں ہوگا۔ اور متعین حالات میں معاشیات کی صوری تقسیموں کی کارکردگی کے لیے مواد فراہم کر دے۔

بلاشبہ۔ اگر دوسرے حالات میں کوئی تبدیلی ہو جائے تو متوقع نتائج کا ظہور پذیر ہونا لازمی نہیں رہ جاتا۔ اس ابتدائی اور پیش پا افتادہ سی بات پر زور دینا اس لیے بہت ضروری ہے کہ معاشیات کے ناقدین کی بڑی تعداد اس نکتہ کو فراموش کر دیتی ہے۔ کوئی سمجھدار آدمی میکانکی قوانین کو لغو اور مہمل کہنے کے لیے تیار نہ ہوگا، اگر ان قوانین کی کارکردگی کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے کوئی تجربہ ایک زلزلے کی وجہ سے بے کار ثابت ہو جائے۔ لیکن عوام کی ایک کافی بڑی تعداد اور بہت سے معاشیات کے ماہرین بھی معاشیات کے قوانین پر ایسے اعتراضات اکثر کرتے رہتے ہیں۔ جن کی بنیادیں کم و بیش اتنی ہی متزلزل اور کمزور ہیں فرض کیجئے کسی چیز پر ایک تامینی ٹیکس لگایا گیا اور اندرونی پیداوار کی کیفیتوں کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ اس چیز کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا۔ اب ممکن ہے کہ فنی ترقیوں یا خام پیداوار کی قیمتوں میں کمی، یا مزدوریوں میں تخفیف یا اسی طرح کی تبدیلیوں کی بنا پر جو صرف پیداوار میں کمی کر دیتی ہیں۔ قیمتوں میں اضافہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس سے معاشیات پر کوئی الزام نہیں آتا کیوں کہ پہلے نتیجے کے اٹل ہونے کی

یہ ضروری شرط تھی کہ پیداوار کے طریقوں میں یا دوسرے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو، اگر یہ حالات بدل گئے تو متوقع نتائج میں تبدیلی بھی ممکن ہے۔ لیکن عوام اور ضابطہ پرست معاشیین کے نزدیک یہی بات معاشیات کے قوانین کو مہمل ثابت کردینے کے لیے کافی ہے۔ اب گویا طلب اور رسد کے قوانین بےکار ہوگئے اور اس علم کی حقیقت واضح ہوگئی جو واقعات کو اہمیت نہیں دیتا۔ اور اسی طرح کے تیز و تند اعتراضات۔ کسی دوسری سائنس کے طالب علموں سے کب اس بات کی توقع کی گئی ہے۔ کہ وہ آنے والی تاریخ کے سارے واقعات کا صحیح صحیح طور پر پورا خاکہ کھینچ دیا؟

اس میں شک نہیں کہ عملی زندگی میں خود مختلف واقعات قابو سے باہر ہوتے ہیں اور مختلف بیرونی اثرات ہمہ وقت ابتدائی حالات میں تبدیلیاں پیدا کر سکتے ہیں اور اس لیے مستقبل کے متعلق کوئی پیشین گوئی خواہ وہ کتنی ہی احتیاط سے کی گئی ہو ایک بہت ہی غیر یقینی کام ہے۔ بہت سی صورتوں میں دیے ہوئے حالات کے بعض حصوں میں معمولی تبادلی کے اثرات کو دوسری تبدیلیاں جو دوسرے حصوں میں اسی وقت اور خود مختارانہ طور پر پیدا ہو رہی ہوں بالکل ہی مٹ سکتی ہے اور ایسے حالات میں کسی متعین وقت میں کارفرما اثرات کا علم کچھ زیادہ مفید نہیں۔ لیکن دوسری طرح کی تبدیلیاں ایسی بھی ہیں، خصوصاً ایسے مسائل میں جہاں صرف

دولت یا پیداوار، دولت کی مختلف شکلوں کا تعلق ہو۔ جہاں اصولوں کی ساری پیچیدگیوں کا علم ایسے نتائج اخذ کر لینے کے لیے بہت ہی مضبوط بنیاد ہے۔ جن کا وقوع بہت ہی ممکن ہے۔ مسائل زر معاشیات کا ایک ایسا ہی حصہ ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں کہ زر کے نظریۂ قدر کا ابتدائی علم بھی ان بے عنوانیوں کی تفصیل کے لیے بہت ہی مضبوط بنیاد تھی جو جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد وقوع میں آئیں۔ وہ لوگ جنھوں نے جرمن مارک اس توقع پر خریدے تھے کہ مارک کی پرانی قیمت پھر اسے واپس مل جائے گی، اگر انھیں اس نظریے کی اس ابتدائی شکل سے بھی واقفیت ہوتی جو سر ولیم پیٹی کو معلوم ہوگی۔ تو انھیں یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کی یہ توقع احمقانہ تھی۔ اسی طرح محض تحلیلی اشیاب کی مدد سے ہمیں یہ پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ ایک تجارتی خوش حالی کے دور کے بعد کساد بازاری کا وقوع تقریباً ناگزیر ہے۔ گو یقین کے ساتھ بتانا ممکن نہیں کہ یہ کساد بازاری کب شروع ہوگی اور کتنی مدت تک باقی رہے گی، کیوں کہ ان کا دارو مدار اس پر ہے کہ خوش حالی کے آثار پیدا ہو جانے پر لوگ کس طرح برتاؤ کرتے ہیں، اسی طرح محنت کی خرید و فروخت کے مسائل ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ اجرت سے متعلق بعض طریقہ ہائے کار کا لازمی نتیجہ بے روزگاری ہوگا۔ اگر دوسرے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ ان نتائج سے بچنے کے لیے" ان دوسرے حالات کی تبدیلی کی نوعیت کیا ہونی چاہیے اگر یہ معلوم ہو جائے تو پھر بڑے

اعتماد کے ساتھ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کسی متعین طریق کار کے عملاً نتائج کیا ہوں گے۔ عملی زندگی میں معاشیات کے قوانین کی مدد سے اخذ کیے ہوئے ایسے نتائج کی بارہا تصدیق ہو چکی ہے۔ اور آج ان قوانین کی افادیت سے انکار بس وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان قوانین کی اہمیت ماننا چاہتے ہی نہ ہوں۔

۶۔ تاہم معاشی قوانین کے اطلاق کی حدیں متعین ہیں اور اگر ہم ان قوانین کو عقل مندی سے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ان حدود کو ٹھیک ٹھیک جان لیں۔ اوپر کی بحث کی روشنی میں ان حدود کا تعین کوئی بہت دشوار کام نہیں ہوگا۔

معاشیات کے طالب علم کا سب سے بڑا دردِ سر افراد کا کردار ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے۔ افراد کے اضافی پسند کی تدریجی ترتیب میں تبدیلی کی نوعیت کا تعین کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور اسی لیے اپنی سب ہی بحثوں میں ہم افراد کی پسند کو ایک مسلمہ فرض کر لیتے ہیں۔ ہاں اس کے بعد ان مفروضات سے کیا نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔ یہ ناگزیر نتائج کے تحت میں آجاتا ہے۔ اور اسی رقبہ میں ہم معاشی کلیات کے اطلاق کے متعلق قطعی قسم کے وعدے کر سکتے ہیں۔

ظاہر ہے معاشی قوانین کو اضافی پسند کی تبدیلیوں کی تشریح سے کوئی واسطہ نہیں اور معاشی اسباب وعلل کی

کار کردگی کا دائرہ اس بنیادی مفروضے کے نتائج تک محدود ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پسند یا اضافی ترجیح کے مسائل سے ہم کوئی لگاؤ ہی نہیں رکھتے۔ کیوں کہ یہ تبدیلیاں ہی تو نظری معاشیات کے سب سے بنیادی مسئلے ہیں، ہمارا منشا یہ ہے کہ بحیثیت معاشیات کے طالب علم کے ہم افراد کی پسند کی تبدیلیوں کے پس منظر کو اُجاگر نہیں کر سکتے۔ معاشی کلیات کی روشنی میں ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ متعین فنی تبدیلیوں اور افراد کی ترجیح سے کیا مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، ان اثرات میں تبدیلی کی بنا پر جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوں ہم ان کی توضیح بھی کر سکتے ہیں، لیکن خود اول الذکر کی تبدیلیوں کی تشریح ہم نہیں کر سکتے۔ ان دونوں قسم کی تبدیلیوں میں امتیاز قایم کرنے کے لیے آسٹرین اسکول معاشی تبدیلیوں کو دو نام دیتا ہے، اندرونی اور بیرونی۔

اوّل الذکر وہ تبدیلیاں ہیں جو مخصوص مفروضات کے دائرے کے اندر واقع ہوتی ہیں۔

موخر الذکر وہ ہیں جو اس دائرے سے باہر شروع ہوتی ہوں۔

اگر ہم نظریۂ زر کے نتائج کو سامنے رکھیں تو اس امتیاز کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ زر کی طلب کے متعلق اگر ہم بعض باتیں مان لیں تو ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ زر کی مقدار میں اضافے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اس کی بیرونی قیمت

ہیں کمی ہو جائے گی۔ یہ ایک "اندرونی" تبدیلی ہے۔ جو نتیجہ ہے ابتدائی مفروضات کا۔ جب تک یہ مفروضہ حالات باقی رہیں گے۔ یہ نتیجہ بھی ناگزیر ہوگا۔ لیکن ہم یہ کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے۔ جیسا کہ پچھلے چند سال میں اکثر کہا گیا ہے۔ کہ اگر بیرونی قیمت میں کمی ہو تو افراط زر بھی لازمی ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ایسا اکثر ہوا ہے۔ اور اکثر حکومتوں نے غلطیاں کی ہیں اور زر کے مقصد کے متعلق غلط نظریات بہت ہی وسیع طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن زر کی بیرونی قیمت میں تخفیف اور زیادہ نوٹ چھاپنے کا فیصلہ کرنے میں باہم کوئی لازمی تعلق نہیں۔ ان میں باہم علت و سبب کا کوئی علاقہ نہیں ہے، ایسا ہونا نہ ہونا ارباب اقتدار کی رائے اور عمل پر منحصر ہے۔ لیکن زر کاغذی کے اجرا اور اس کی بیرونی قیمت میں کمی کے درمیان اس معاشرہ کے افراد کی صرف دولت سے متعلق عادتوں میں کسی تبدیلی کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

اس تقسیم کی افادیت کی ایک اور ذرا پیچیدہ مثال پچھلی جنگ عظیم کے تاوان جنگ کا مسئلہ ہے۔ فرض کیجئے کہ یہ بات ثابت کی جاسکتی کہ جرمنی کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے لیے بیرونی دنیا کی طلب میں اضافہ ممکن نہ تھا اور اس لیے کم سے کم شروع میں اندرونی محاصل کے بوجھ کے ساتھ ساتھ تاوان کی ادائیگی کا بوجھ جرمن آبادی کے لیے بہت ہی بھاری ہوگا۔ اگر ایسے حالات ہوتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ موجودہ بحران براہ راست

معاشی اسباب کا نتیجہ ہی۔ یعنی عام بے چینی کے پھیلنے سے پہلے تک جو پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں وہ سب نتیجہ تھیں دنیا میں اشیاء کی طلب و رسد کے حالات کا لیکن فرض کیجیے کہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ ان دقتوں کا بنیادی سبب مالی بحران ہی جو محاصل کے ابتدائی بوجھ کی گراں باری کے پیش نظر سیاسی بغاوت کے اندیشہ سے پیدا ہوا تو پھر یہ کہنا ممکن نہ ہوگا۔ کہ اسباب کی کڑی تمام تر معاشی تھی کیوں کہ یہاں محاصل کے بوجھ کا سیاسی ردعمل ایک غیر متعلق سوال ہی۔ اس صورت میں تاوان کی ادائیگی کا لایا ہوا مالی طوفان "بیرونی" اسباب کی وجہ سے واقع ہوا۔

یہ صحیح ہی کہ ہمیشہ یہ امتیاز آسانی سے قایم نہیں کیا جاسکتا مثلاً بعض حالات میں اجرت کی شرحوں اور کام کرنے والی آبادی کے کام کی مقدار اور نوعیت کے اضافے میں کوئی باضابطہ تعلق ہو۔ اسے ہم کس نقطۂ نظر سے دیکھیں گے۔ جہاں تک تاثر کا تعلق ہی وہ تو "اندرونی"، ہی لیکن بازار میں طلب کی نوعیت اور شکل ایک "بیرونی" عنصر ہی کیوں کہ یہاں نئے افراد جن کی پسند مختلف ہی تصویر میں شامل ہوگئے ہیں، پھر جیساکہ پروفیسر نائٹ نے اکثر بتایا ہی اس سوال میں مزید پیچیدگی اس بات سے پیدا ہو جاتی ہی کہ بعض جماعتوں میں افراد کا مالی نفع اس بات کا محرک بنتا ہی کہ وہ انھی چیزوں کو بدلنے کی کوشش کریں۔ جنھیں معاشیات مقدمات کے طور پر سامنے رکھتی ہی۔ فنی معلومات

میں اضافہ کرنے کے لئے عملی تحقیق پر بڑی رقمیں خرچ کی جاتی ہیں اور لوگوں کو اپنی پسند میں تبدیلیاں پیدا کرنے کی ترغیبیں دلائی جاتی ہیں۔ ایسی تبدیلیوں کے سلسلے میں بھی اس تقسیم سے کام لینا دشوار ہے۔ ہمارے موضوع کو حصوں میں الگ الگ اس طرح تقسیم کیا نہیں جاسکتا کہ ایک حصہ دوسرے سے بالکل متاثر نہ ہو۔ پھر بھی بہت سارے مسائل ایسے ہیں جہاں یہ حدبندی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور مسائل کے متعلق غور و فکر میں مفید ہے اور جب تک معاشی مسائل بہت زیادہ واضح نہ ہو جائیں اسے باقی رکھنا ضروری نظر آتا ہے۔

اسی طرح ہمیں یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ عملی مسائل کی بحثوں میں ہمیں بعض اوقات ایسی "بیرونی" تبدیلیوں سے واسطہ پڑتا ہے جو بظاہر معاشی اسباب و علل کے دائرے کے اندر معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً مسائل زر سے بحث کرتے وقت یہ اندیشہ ضرور نگاہ میں ہوگا کہ کہیں گرتی ہوئی بیرونی قیمت کی وجہ سے ارباب اقتدار کاغذی زر کا اجرا نہ شروع کر دیں، اسی طرح کسی عملی منتظم کو تامینی پالیسی کے اس خطرے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ تامین کی آڑ لے کر کہیں کوئی اندرونی اجارے پیدا نہ ہو جائیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے مسائل میں بہت سے نفسیاتی امکانات ایسے ہوتے ہیں جنھیں عملی نقطۂ نظر سے نظر انداز کرنا نہیں چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان مسائل کو سمجھنے کے لیے معمولی درجے کی فہم درکار ہے گو یہ ایک اچنبھے کی

بات ہی کہ بڑی کافی تعداد اس سے بھی بے بہرہ نظر آتی ہی۔ بہت سے امکانات تو تقریباً یقینی ہوتے ہیں اور کوئی عقل مند آدمی ان کو سیاسی کارکردگی کے لیے کار آمد اصول ماننے میں ہچکچاہٹ سے کام لے گا۔ لیکن اسے کیا کیجیئے کہ ان مباحث میں شریک ہونے والے سبھی عقل و سمجھ سے بھرپور نہیں ہوتے۔ معاشیات کے ایک ماہر کے لیے اپنے علم سے کار آمد نتائج اخذ کرنے کے لیے یہ ضروری ہی کہ وہ ان متعلق مسائل سے بھی واقفیت رکھے اور عملی مسائل کے حل کرنے میں ان سے استفادہ کرے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہی کہ خالص معاشی کلیات اور اس طرح کے "عمرانی تصورات" میں جو تیقن کے لحاظ سے معاشی کلیات کا درجہ نہیں رکھتے امتیاز قایم رکھا جائے۔ معاشیات کے کلیات کے یقینی اطلاق کے حلقے کو کم بتانے سے معاشیات کے وقار کو ہرگز کوئی صدمہ پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہی کہ ایسا کردینے کے بعد ہی بقیہ رقبے پر معاشی کلیات کے اٹل ہونے کا یقین زیادہ آسانی سے دلایا جا سکتا ہی۔

اوپر کی گفتگو کے بعد اب ہم پھر اس سوال پر غور کر سکتے ہیں جو پچھلے باب کے آخر میں اٹھایا گیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہی کہ ہم معاشیات کے کلیات کو اس طرح وسعت دے سکیں کہ وہ معاشی مقدارات کی تبدیلیوں کا بھی احاطہ کرلیں؟ معاشی تبدیلیوں سے ہمارا منشا جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہی یہ تھی کہ کیسے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے کے مطابق معاشی نظام میں ضروری

تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کیا ہم اپنے طرز فکر کو اس طرح بدل نہیں سکتے کہ ان ہونے والی تبدیلیوں کے متعلق بھی پورا علم حاصل کر سکیں؟ یعنی کیا معاشی ترقی کا کوئی مکمل نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ہمارا خیال صحیح ہو تو اس مقصد کے حصول کے امکانات بہت ہی مشتبہ ہیں۔ ساری ممکن چیزوں کی طلب کی تغیر پذیری کے متعلق اگر ہم ایک مرتبہ ایسی ٹھوس اور یقینی بات معلوم کر سکتے جس کے بعد ان چیزوں میں کسی مزید تبدیلی کا امکان باقی نہ رہ جاتا تو شاید یہ تصور ممکن ہوتا کہ ایسے معاشی اندازے لگائے جائیں کہ ہماری معاشی دنیا کی مستقبل کی تصویر صحیح صحیح کھینچی جا سکے۔ لیکن اس طرح کے اندازے گو وہ مستقبل قریب میں امکانی تبدیلیوں کے سمجھنے میں معاون ہو سکتے ہیں کوئی دائمی قیمت نہیں رکھتے۔ لیکن ہم کو اس مقصد میں ناکام رہنا ہوگا۔ کیوں کہ ہمارے نظام میں اس طرح کے دوامی اثرات نہیں۔ ہمیں ہر لمحہ اپنا مرکز ثقل نئے سرے سے دریافت کرتے رہنا ہوتا ہے۔

لیکن کیا ایسے تصورات کا بھی قیام ممکن نہیں کہ جن کی مدد سے ہم معاشی مقدمات کی اہم تر تبدیلیوں کے متعلق پیشین گوئی کر سکیں۔ مخصوص اشیا کی پسند یا ناپسند کے متعلق، یا مختلف اشیاء کے باہمی مبادلے کے تناسب کے متعلق ممکن ہی ہم کوئی یقینی بات نہ بنا سکیں۔ لیکن

اوپر جس قسم کی تبدیلیوں کا ہم نے ذکر کیا ہو۔ انھیں "اندرونی" تبدیلیوں کا جز سمجھ کر بھی کیا یہ ممکن نہیں کہ مستقبل کے امکانات کے متعلق کوئی مفید بات بتائی جا سکے آمدنی کی تبدیلیوں سے لوگ کس طرح متاثر ہوتے ہیں، یا نئی دریافتوں سے زندگی پر کیا اثرات ممکن ہیں یہ اور اس طرح کے دوسرے رجحانات جو معاشی زندگی میں تغیر و تبدل کا باعث ہوتے ہیں اگر ہم انھیں معاشی اسباب کا نتیجہ فرض کر لیں تو بھی کیا مستقبل کے متعلق کوئی کارآمد بات یقین کے ساتھ کہنا معاشیات کے لیے ممکن نہ ہوگا؟

بلاشبہ جہاں تک آبادی کی تبدیلیوں کا تعلق ہی۔ ہم ان تغیرات کو مالی محرکات کا نتیجہ تصور کر سکتے ہیں۔ کلاسی کل معاشیین کی طرح ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ آخرکار ایک ایسے نقطے پر پہنچ کر جہاں محنت کا معاوضہ، بچے پیدا کرنے، ان کی تربیت کرنے اور انھیں کارآمد مزدور بنانے کے تمام اخراجات کو کافی ہو جائے۔ آبادی کے مختلف رجحانات متوازن ہو جائیں گے۔ ہاں یہ مشتبہ ہی کہ اس مخصوص تعلق کو صحیح مان کر غلاموں کے کسی ملک کے علاوہ کسی اور معاشرے میں بھی کوئی مفید نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں، کیوں کہ ایسی سوسائٹی کے علاوہ کسی اور شکل میں کلاسی کل معاشیین کی طرح یہ فرض کر لینا محال ہی۔ کہ اس سلسلے کے سارے اخراجات اور فوائد سب کے سب مخصوص نہیں۔ یعنی (غلاموں کے ملک کے علاوہ) توازن کے

قیام کے لیے اجرت کی وہ شرح ضروری ہے جو مزدوروں کی رسد کو کسی ایک تعداد پر باقی رکھنے کا باعث ہو۔ محض وہ جسم کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کافی ہو۔ پھر بھی اس طرح کا ایک تصور ممکن ہے گو اس کی افادیت خواہ کچھ بھی ہو۔

لیکن اس شکل میں بھی ہم صرف توازن کی ایک شرط معلوم کر سکے ہیں۔ ہم اب بھی ان حالات کے متعلق کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتے جن پر مزدوروں کی رسد کی تبدیلیوں کا دارومدار ہے۔ خاندان کے افراد کی مناسب ترین تعداد کیا ہے۔ یا کتنے غلاموں کی پرداخت پسندیدہ ہے؟

یہ سوالات اب بھی ہمارے علم کی حد سے باہر ہیں۔ کون بتا سکتا ہے کہ افراد خاندان کی تعداد کے متعلق مروجہ نظریات جو اگر چند ہزار سال تک باقی رہ جائیں تو یورپ کی آبادی صرف چند لاکھ افراد سے زیادہ نہ رہ جائے گی، قائم رہیں گے یا نئے عقائد، انسانی فرض کے نئے تصورات اور اچھی زندگی کے نت نئے معیاروں کے پیش نظر ختم ہو جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ظن و تخمین سے کام لینا ہم سب کے لیے ممکن ہے۔ لیکن معاشیات کو اس قیاس آرائی سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہو سکتا۔

ایجادات یا فنی تبدیلیوں کا مسئلہ اور بھی ٹیڑھا ہے۔ پروفیسر شمپیٹر کے قول کے مطابق تو یہ ممکن نہیں کہ صاف صاف یہ بتایا جا سکے کہ اس نقطۂ نظر سے معاشی توازن کے لیے کیا تبدیلیاں ضروری ہوں گی۔ لیکن فرض کیجیے ہم کسی طرح یہ

پتہ لگا بھی لیں تو بھی اس راہ میں آنے والی تبدیلیوں کی ماہیت کا ہم کیوں کر پتہ لگا سکتے ہیں۔ معاشی تحقیقات کا آخر وہ کون سا طریقہ ہے جس سے ایک طرف تو ریلوں کی ایجاد کا پتہ لگ جائے اور دوسری طرف از خود چلنے والے انجن کی آمد کی تاریخ بتائی جا سکے۔ یہ فرض کر لینے کے بعد بھی اگر ہم کو صحیح تحقیق کا ڈھنگ آتا ہو تو ہم ان معاشی تعلقات کی نوعیت کا جو ان ایجادوں کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوں گے۔ اندازہ کر سکتے ہیں، گو یہ بھی ایک بحث طلب امر ہے۔ تو ہم اس طریقے کے متعلق آخر کیا پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے اچھی طرح واضح ہو گیا ہو گا۔ یہ ذرا بھی صحیح نہیں کہ معاشی تغیرات کے سبھی رجحانات کا رخ ایک ہے۔ اور جبریت کا قائل ہوئے بغیر بھی ہم کو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ معاشی تغیرات کے متعلق ٹھیک ٹھیک پیشین گوئی ممکن نہیں۔

اسی طرح اس سوال کا حل بھی آسان نہیں کہ سوسائٹی کے ان قوانین میں کیا تبدیلیاں ہوں گی۔ جن کی حدود کے اندر رہ کر معاشی زندگی پھل پھول رہی ہے۔ ایک طرح تو سیاسیات ہمارے موضوع کا ایک اہم جزو ہے۔ کیوں کہ حکومت کا نظام، ملکیت کے قوانین اور اس طرح کے اور بہت سارے مسائل انتخاب کا نتیجہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ لیکن پہلے سے ہم کیوں کر بتا سکتے ہیں کہ کب کون سا قانون پسند کیا جائے گا اور کس سیاسی نظام کو لوگ ترجیح دیں گے۔

ایک مشہور رائے یہ ہے کہ سیاسی اداروں کے ارتقا کا
تعلق معاشی طاقت کی تقسیم اور معاشی مفاد کی کار فرمائی پر ہے
اور اس سے انکار کرنا غلطی ہوگی کہ ایک خاص حد کے اندر
اس رائے کی تائید میں ایسی مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں جو
کم سے کم سمجھ میں آجانے والی ہیں۔ لیکن ذرا غور سے دیکھئے
تو وہ حدود عام تعین کے خلاف بہت ہی تنگ نظر آئیں گی
ہم خاص خاص سیاسی تبدیلیوں کو دولت پیدا کرنے والی
خاص خاص جماعتوں کے مفاد کا نتیجہ کہ سکتے ہیں۔ قلیل مدت
کے مفاد کا بازار ایک سطحی اشاریہ ہے۔ اور یہ تصور ایک معروضی
تصور ہے۔ لیکن اس رائے کے مطابق بڑے بڑے مسائل کی
تشریح کا انحصار اس مفروضہ پر ہے کہ بڑی بڑی جماعتوں کا
مفاد بھی اسی طرح معروضی الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ ایسا
نہیں اس طرح کی معاشی تشریح کو معاشیات مدد نہیں دیتی،
بلکہ اسے قطعاً غلط سمجھتی ہے۔ ان تمام تشریحوں میں مفاد کا
تصور خارجی نہیں داخلی ہے۔ یعنی مفاد کا تعین لوگوں کی خواہش
اور یقین پر ہے اور معاشیات افراد کے جذباتی مدوجزر کے
ناپنے کا کوئی آلہ نہیں بنا سکتی ہے۔ جب یہ تبدیلیاں عملی زندگی
میں رونما ہوں گی، تو ان کے اثرات کیا ہوں گے؟
یہ تو شاید ہم بتا سکتے ہیں۔ اسی طرح مفروضہ تبدیلیوں
کے اثرات کے متعلق ظن و تخمین سے بھی ہم کام لے سکتے ہیں
سیاسی اداروں کی دوسری شکلوں کو سامنے رکھ کر ہم ان

کے استحکام یا ان میں تبدیلی کے رجحانات سے بحث کرسکتے ہیں۔ لیکن کسی متعین تبدیلی کے مختلف مدارج کے متعلق اظہار خیال کی طاقت ہم میں نہیں کیوں کہ اس طرح کی تبدیلیوں کا انحصار اتفاق، ترغیب و ترتیب جیسے مختلف عناصر پر ہی اور ان سارے عناصر کی اہمیت یا ان کے رخ کے تعین کے متعلق ہمیں انکسار سے کام لینا پڑے گا۔

معاشیات کے مطالعے سے ہمیں زندگی کے ایک ایسے پہلو کا پتا ملتا ہی جہاں معاشی قوانین کی کارفرمائی ہی۔ جہاں ایسے اصول رائج ہیں جن کے سامنے انسانی کردار کو سر جھکا دینا پڑتا ہی۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں ایسا ایک حصہ بھی ملتا ہی جہاں اس طرح کے جبر کی کارفرمائی نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں کوئی قوانین نہیں، یا زندگی کو کسی قسم کی مجبوریوں کا سامنا نہیں کرنا ہوتا۔ ہم اس سوال سے مطلب نہیں رکھتے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے زندگی کے یہ مسائل معاشیات کی بحثوں کا نقطۂ آغاز ہیں مگر خود ان کے آغاز کی تاریخ سے ہم آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔

(۶)

معاشیات کی اہمیت

اب ہم اپنے کام کی آخری منزلوں پر پہنچ رہے ہیں۔ اب ہم معاشیات کے موضوع کا تعین کر چکے ہیں، نیز ہم نے معاشی کلیات کی ماہیت، اور روزمرہ کی زندگی کے واقعات کی تشریح و توضیح میں ان کی کارکردگی کا بھی پتا لگا لیا۔ اب ہمیں اس آخری سوال کا جواب دریافت کرنا ہے: سماجی زندگی اور انسانی کردار کے لیے ان کی کیا اہمیت ہے، معاشیات کا عمل سے کیا تعلق ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نظری معاشیات کے بعض اصول بہ ذاتِ خود عمل کے لیے اچھے معیار کا کام دے سکتے ہیں۔ گھٹتے افادہ کا قانون تقسیم دولت سے متعلق تمام معاشری اور سیاسی جدوجہد کے لیے معیار سمجھا جاتا ہے۔ کوئی ایسا اقدام جو دولت کی تقسیم کو زیادہ مساوی بنائے، اور اس سے دولت کی پیداوار پر کوئی مضر اثر نہ پڑے اچھا اقدام ہے۔ اس کے برخلاف دولت کی مزید

غیر مساویانہ تقسیم اِس قانون کے مطابق ایک غلط اقدام ہے اور اس رائے کو بہت ہی بڑے معاشیین کی حمایت حاصل ہے۔ مالیات عامہ کے نظری مسائل کا بیشتر حصہ اسی قانون کی بنیادوں پر قائم ہے۔ فیبین اشتراکین کی تنقید سے معاشیات کا جواب پروفیسر کینن جیسے عظیم المرتبت استاد معاشیات نے انھی کی مدد سے دینے کی کوشش کی ہے۔ علمی معاشیات کی بے شمار کتابوں میں ان اصولوں کی حمایت ملتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریز معاشیین کی اکثریت کے نزدیک ان کی سچائی کسی دلیل یا حجت کی قطعاً محتاج نہیں ہے۔ پھر بھی میرا ناچیز خیال یہ ہے کہ سائنٹفک معاشیات کا کوئی بھی اصول ان نتائج کی حمایت نہیں کرتا۔ اور اس ملک سے باہر ان اصولوں اور ان کے عملی نتائج دونوں ہی کا اقتدار ختم ہو چکا ہے۔

چند دلیلوں کی مدد سے اِن نتائج کو صحیح ثابت کیا جاتا ہے، وہ معلوم و مشہور ہیں۔ پھر بھی انھیں تفصیل سے بیان کر دینا بہتر ہوگا تاکہ یہ آسانی سے پتہ چل سکے کہ یہ دلیلیں کہاں کہاں کمزور ہیں۔ گھٹتے افادے کا قانون یہ ہے:۔ اگر کسی کے پاس کسی چیز کی کافی مقدار موجود ہو تو اس کی مزید مقدار کی ملکیت کی اہمیت اس کے نزدیک کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کی مدد لے کر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی کی حقیقی آمدنی یا وسائل کافی ہو تو اس کی آمدنی میں مزید اضافہ اس کے لیے گھٹتی ہوئی اہمیت رکھتا ہے۔

اس لیے ایک امیر آدمی کی جدّی آمدنی کی اہمیت غریب کی حدی آمدنی سے کم ہی اس لیے اگر بڑوں کی دولت کا کچھ حصہ غریبوں تک پہنچ جائے تو اس سے سوسائٹی کے لیے مجموعی افادیت میں اضافہ ہوگا، بشرطے کہ اس تبدیلی سے پیداوار دولت پر کوئی مضر اثر نہ پڑے۔ ایسی صورت میں یہ تبدیلیاں معاشی حیثیت سے مناسب ہیں۔

بہ ظاہر یہ رائے بے حد معقول نظر آتی ہی۔ لیکن اگر ہم ذرا غور سے دیکھیں تو اس کی غلطی واضح ہوجاتی ہی۔

اس دلیل کی بنیاد اس مفروضے پر ہی کہ گھٹتے افادے کا قانون نفسیات کے میدان میں بھی صحیح ہی۔ مگر اس قانون کے اطلاق کی حدود کی یہ وسعت قطعاً غیر مناسب ہی۔ یہ قانون معاشی اشیا کے بنیادی تصورات کا ہرگز نتیجہ نہیں اور اس کی بنیاد ایسے مفروضات پر ہی۔ جن کی سچائی یا جھوٹ عام مشاہدہ یا مشاہدۂ نفس دونوں میں سے کسی کی مدد سے بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

زیر بحث قضیہ کی سچائی اس ٹیڑھے مابعد الطبیعاتی مسئلے کے حل پر ہی کہ دو افراد کے احساسات کا سائنٹفک طریقے سے مقابلہ کیا جا سکتا ہی یا نہیں، آئیے ذرا اس نقطے کو تفصیل سے سمجھ لیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں گھٹتے افادے کا قانون، مقاصد کے حصول کے لیے ذرائع کی قلت کے تصور

سے ماخوذ ہے، اس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ ہر شخص کے لیے مختلف اشیا کی اہمیت مختلف ہوتی ہے۔ اور ان میں سے بعض کو بعض پر ترجیح حاصل ہے، اور اس معنی میں یہ بھی صحیح ہے کہ کسی چیز کا ایک استعمال دوسرے استعمال سے زیادہ اہم ہو سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر ہم "مختلف افراد کے مرجحات کی دو[2] فہرستیں بنا سکتے ہیں۔ اور چوں کہ ہر شخص کی پسند مختلف ہوگی۔ اس لیے ان بنیادوں پر مبادلۂ دولت کا ایک مکمل نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح ہم ایک ایسی فہرست بنا سکتے ہیں جس سے یہ پتہ چل جائے کہ بعض مخصوص حالات میں ایک شخص مختلف ممکن چیزوں میں سے کن کو پسند کرے گا۔ اور اس فہرست کا ایک دوسرے شخص کے فرضی مرجحات کی فہرست سے مقابلہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ فرض کیا کہ ان فرضی مرجحات سے جو آسودگی حاصل ہو سکتی ہے یا ہوگی ہم دونوں شکلوں میں اس کی مقدار بھی متعین کر سکتے ہیں اور اسے ناپ بھی سکتے ہیں۔ بالکل دوسری بات ہے۔ موجودہ معاشی تشریح و توضیح میں اس مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر یہ مفروضہ افراد کی مفروضہ "مرجحات کی فہرست" کے تصور سے بالکل جداگانہ تصور ہے۔

نظریۂ مبادلۂ دولت کا بنیادی مفروضہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ۶ آنے کی روٹیاں اس کے لیے زیادہ آسودگی کا باعث ہوں گی یا ۶ آنے کے انگور اور اسی طرح ایک شخص کی "مرجحات کی فہرست" دوسرے شخص کی "فہرست مرجحات" سے ملائی جاسکتی ہے۔ لیکن نظریۂ مبادلے کے لیے یہ بالکل ضروری نہیں کہ وہ اس سوال کا بھی جواب ڈھونڈھے کہ ۶ آنے کی روٹیاں خریدنے سے مجھے جو آسودگی حاصل ہو وہ نان بائی کی آسودگی کے مقابلے میں جو ان ۶ آنوں کی وصولی سے اسے حاصل ہوگی کتنی ہوگی؟ یہ تقابل ایک بالکل ہی مختلف قسم کا تقابل ہے۔ جس کی نظریۂ توازن کے لیے قطعی ضرورت نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کا تقابل تمام انتہائی علوم کے موضوع بحث سے خارج ہے یہ کہنا کہ زید کے مرجحات کی اہمیت عمر کے مرجحات کی اہمیت سے زیادہ ہے ایک الگ بات ہے یہ کہنا کہ زید ن کو م پر ترجیح دیتا ہے اور عمر م کو ن پر ایک بالکل مختلف بات ہے، اول الذکر شکل میں ہمیں رواجی معیاروں سے کام لینا پڑے گا۔ اور اس لئے یہ سوال لازماً انفرادی ذوق کا ہے جو کسی سائنس کا بھی موضوع نہیں۔

ممکن ہے ہمارا مقصد اب بھی واضح نہ ہوا ہو۔ اس لیے ایک مثال کی مدد سے اسے اور واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ دو آدمیوں کے درمیان اس بات پہ

اختلاف رائے پیدا ہو کہ زید کن چیزوں کو پسند کرتا ہے اور کن چیزوں کو نہیں۔ ایک آدمی کے نزدیک اگر کچھ قیمتیں بازار میں رائج ہوں تو زید ن کو م پر ترجیح دے گا۔ اس کے برخلاف دوسرے کی رائے یہ ہو کہ انھی قیمتوں پر وہ م کو ن پر ترجیح دے گا۔

اب اس اختلاف رائے کو ہم بڑی آسانی سے مٹا سکتے ہیں، یا تو ہم خود زید سے پوچھ لیں کہ اس کا طرز عمل کیا ہوگا۔ یا اس کے سامنے ان چیزوں کو مفروضہ قیمتوں پر پیش کر کے دیکھ لیں کہ اس کا برتاؤ کیا ہوتا ہے۔ عام مشاہدہ، یا مشاہدۂ نفس ان دو سائنٹفک طریقوں میں سے کسی ایک کی مدد سے یہ اختلاف رائے مٹ سکتا ہے۔

لیکن فرض کیجئے کہ دو آدمیوں کے درمیان اس بات پر اختلاف رائے پیدا ہو جائے۔ کہ زید کو اپنی ایک ہزار روپے ماہوار کی آمدنی سے جو سکون حاصل ہوتا ہے اتنا ہی آرام عمر کو اپنی ۲۰۰۰ روپے ماہوار کی آمدنی سے حاصل ہوتا ہے۔ ان سے پوچھ کر ظاہر ہے۔ ہم اس اختلاف رائے کو نہیں مٹا سکتے کیوں کہ ان میں سے دونوں ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی آمدنی سے انھیں زیادہ آسودگی حاصل ہوتی ہے۔

اب یہاں کوئی سائنٹفک ثبوت ملنا ممکن نہیں، ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس کی مدد سے ہم زید کی آسودگی کی مقدار کا پتہ لگا لیں اور اس کا عمر کی آسودگی سے مقابلہ کر لیں

ذاتی مشاہدۂ نفس کی مدد سے زید یہ نہیں بتا سکتا کہ اس وقت عمر کے دماغ میں کیا کیفیات کارفرما ہیں اور خود ہم اندرونی سکون، یا آسودگی کا مشاہدہ کر ہی نہیں سکتے۔ مختصر یہ ہے کہ مختلف افراد کی آسودگی ناپنے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔

یہ بیشک صحیح ہے کہ ہم عمل زندگی میں یہ اکثر فرض کر لیتے ہیں کہ اس طرح کا تقابل ممکن ہے۔ لیکن یہ محض ایک رواجی بات ہے۔ مختلف حالات میں، مختلف مقامات پر اس تقابل کے لیے ہم مختلف مفروضات کی آڑ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں اس طرح حاصل کردہ نتائج کی کوئی سائنٹفک قیمت نہیں۔ مغربی جمہوریتوں میں ہم بعض مقاصد کے لیے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایک ہی حالات میں زندگی بسر کرنے والے افراد کو ایک ہی طرح کا آرام یا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح انصاف کے لیے ایک سی حالتوں میں ہم مختلف افراد کی ذمہ واری کو مساوی تسلیم کر لیتے ہیں اسی طرح "مالیات عامہ" کے مقاصد کے لیے ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مختلف افراد جن کی آمدنیاں ایک سی ہوں اور جو ایک سے حالات میں رہ رہے ہوں، ایک سی آسودگی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ مفروضہ محاصل لگانے میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن ہم یہ کسی طرح بھی ثابت نہیں کر سکتے کہ اس مفروضے کی بنیاد ایسے واقعات پر ہے جن کی صداقت آزمائی جا سکتی

ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر کسی دوسری تہذیب کے ماتحت زندگی بسر کرنے والا یہ کہے کہ ہمارا یہ خیال غلط ہے۔ اور اس کی ذات، یا اس کی نسل کے افراد ایک حقیر ذات یا نسل کے افراد سے دس گنا زیادہ آسودگی پونجی کی ایک ہی مقدار سے حاصل کر سکتے ہیں۔ تو ہم اس کی رائے کو غلط ثابت نہیں کر سکتے۔ ہم اس کا مذاق اڑا سکتے ہیں، ہم اس پر خفا ہو سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ طرز فکر قابل نفریں ہے، ذات پات کے متعلق یہ خیالات باہمی کشمکش کا باعث ہیں۔ بعض طبقوں کو مراعات عطا کرتے ہیں، لیکن یہ ہم کسی طرح نہیں کر سکتے کہ اس کی رائے کی غلطی یا خود اپنی رائے کی صحت اس طرح ثابت کر دیں کہ کسی اختلاف رائے کی گنجائش باقی نہ رہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ہم خود مختلف افراد کی ایک ہی ذریعے سے حاصل کردہ آسودگی کو یکساں اہمیت نہیں دیتے، اس لیے بھی یہ واقعی ایک عبث سی بات ہے کہ ہم خواہ مخواہ اپنے کو اس دھوکے میں ڈالیں کہ ہماری رائے کو سائنٹفک دلیلوں کی ٹھوس حمایت حاصل ہے۔ ہم اپنی رائے کو سہولت کے خیال سے قابل قبول قرار دے سکتے ہیں۔ یا ہم انصاف کے اعلےٰ اصولوں کی پناہ لے سکتے ہیں، لیکن کسی طرح کے اثباتی علم کی مدد سے ہم اپنی رائے کی تائید ہرگز حاصل نہیں کر سکتے۔

اسی لیئے گھٹتے افادہ کے قانون" کو اس طرح توڑ مروڑ کر استعمال کرنا مناسب نہیں، اور اس لیئے وہ تمام دلیلیں جو اس قانون کی رد کے واسطے پیش کی جاتی ہیں۔ کوئی سائنٹی فک بنیاد نہیں رکھتیں، یہ مان لینے سے ایک بات ضرور ہوگی۔ علمی معاشیات کی بحثوں میں جو بہت سے اصول سائنٹی فک قوانین یا کلیات کے رتبے کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے رتبے میں کمی ہو جائے گی۔ گھٹتی ہوئی اضافی قدر کا تصور اس نتیجے کی حمایت نہیں کرتا کہ اگر امیروں کی دولت کو غریبوں کے درمیان بانٹ دیا جائے تو اس سے مجموعی آسودگی میں اضافہ ہوگا۔

اس قانون سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ آمدنی پر اگر ایک درجے واری محصول لگایا جائے تو وہ قومی خوش حالی کے لیے غیر درجے واری محصول سے اچھا ہوگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس گفتگو کی روشنی میں ہمیں مالیات عامہ کی ان تمام بحثوں کو جو "اجتماعی افادہ" کے موضوع سے متعلق ہیں۔ معاشیات کے موضوع سے خارج سمجھنا پڑے گا۔

اخلاقیات کی بحثوں کے نقطہ آغاز کی حیثیت سے ممکن ہو یہ تصور بہت دل چسپ ہو، لیکن وہ نظری معاشیات کے اثباتی مفروضات سے کسی طرح مستنبط نہیں ہوتا۔ معاشیات کے عروج کے ابتدائی ادوار میں اُسے نظریۂ افادیت سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اور یہ تصور اسی اتفاقی تعلق کی ایک

یادگار ہے۔ اور افادی مفروضات اور تحلیلی معاشیات دونوں ہی کی اہمیت اور تائید میں ان کے افتراق سے بڑا اضافہ ہوجائیگا

لیکن اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ ہماری یہ ساری بحث غلط اور بے بنیاد ہے اور ہم ان اجتماعی مفروضات کو اثباتی علوم کے کلّیات کا درجہ دے سکتے ہیں، پھر بھی ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کر لیجیے کہ ایک کیفیت سے سرور و انبساط حاصل کرنے کی صلاحیت مختلف افراد میں بالکل یکساں ہوتی ہے۔ اور نیز مختلف کیفیتوں کو ہم کسی ایک ہی پیمانے سے ناپ سکتے ہیں اور فرض کیجیے اس تصور کی مدد سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ کوئی "اجتماعی تدبیر"، "اجتماعی افادہ" میں اضافے کا باعث ہے۔ لیکن یہ مسئلہ تو اب بھی حل نہیں ہوا کہ اس اجتماعی پالیسی پر عمل بھی کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ اب بھی ایک ٹیڑھے سوال کا حل باقی ہے کہ کیا "اجتماعی افادہ" میں اضافہ کرنے کی کوششیں کرنا معاشرت کا فرض ہے؟ اور موضوع کی اس توسیع کے باوجود جس میں ہم نے اجتماعی مفروضات کو بھی جگہ دے دی ہے معاشی کلیات اس مسئلے کو حل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں بتاتے۔ وہ مسائل جو "کیا ہونا چاہیئے" کے تحت آتے ہیں۔ ان مسائل سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتے ہیں جو "کیا ہے" کے تحت آتے ہیں۔ لیکن ہم اس سوال سے تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں کریں گے۔

۳۔ اگر قیمتوں کے آزاد توازن کو معاشی مقبولیت کا بھی

معیار قرار دیا جانے لگے تو اس قسم کی کوششوں پر بھی بالکل اسی طرح کے اعتراضات کیے جا سکتے ہیں، جن سے ابھی ہم نے بحث کی ہے۔ نظریۂ توازن کی مدد سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح مختلف افراد کی اپنی اپنی جداگانہ پسند اور ایک مخصوص قانونی اور فنی معلومات کے ماحول میں مبادلے کے باہمی تعلقات کا ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جس میں تبدیلی کے کوئی رجحانات نہیں ہوتے۔ اس نظریے کی مدد سے ہم ذرائع پیداوار کی اس تقسیم کا پتہ لگالیں گے جو افراد کے ایک متعین نظام طلب کے لیے سب سے زیادہ مفید ہو۔ لیکن خود اس توازن سے کوئی اخلاقی قوانین ہاتھ نہیں آتے صرف یہ ثابت کر دینے سے کہ بعض حالتوں میں طلب کی پوری پوری آسودگی ذرائع پیداوار کو ایک خاص طرح استعمال کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ دوسری طرح سے نہیں، یہ لازم نہیں آتا کہ یہ صورت حال پسندیدہ بھی ہے۔ ممکن ہے لوگ شراب اور ناچ و رنگ کے ہی خواہش مند ہوں۔ ان کی خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تسکین وقت، اور دوسری متعلق چیزوں کو ایک خاص طرح استعمال کرنے سے ہی حاصل ہو سکے گی۔ اگر کوئی اور طریقہ استعمال کیا جائے تو یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ اور باہمی مبادلے میں توازن قیمت ممکن نہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں نظریۂ توازن کو استحسان یا پسندیدگی کی کوئی سند حاصل نہیں۔ نظریۂ

توازن قیمت میں فی نفسہ تنقیص یا تعریف کا کوئی پہلو نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ توازن کے تصور کی بنیاد ہی اس پر ہی کہ بعض ذرائع کی ملکیت حاصل کر لینے کے بعد ہر شخص کو بعض چیزیں منتخب کرنے کا ایک حق مل جاتا ہی۔ لیکن اس کا انتخاب عادی ماحول کا پابند ہوتا ہی۔ اگر وہ چاہیے کہ اپنے ذرائع کو کسی ایسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے استعمال کرے جو ابھی اس سوسائٹی نے بنانا ہی نہیں سیکھا ہی تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ اسی طرح ہر فرد کا حق انتخاب دوسروں کے حق انتخاب سے بھی متاثر ہوتا ہی۔ جب مختلف قیمتیں متوازن ہو چکی ہوں اس وقت بھی ہر شخص کو اپنے برتاؤ میں تبدیلی کا حقِ باقی رہتا ہی۔ لیکن تب کوئی بھی اپنے اس حق کو استعمال نہیں کرتا۔ کیوں کہ مفروضہ حالات میں کوئی اور اقدام زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ اگر ہم فلسفۂ سیاسیات کے بعض اصولوں کے معیار مان لیں تو یہ تصور اس مقصد میں ہماری بڑی مدد کر سکتا ہی کہ ہم یہ پتہ لگائیں کہ کس طرح کے اداروں میں یہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ ممکن ہی کہ حق انتخاب کو کوئی بڑی پسندیدہ چیز نہ سمجھا جائے۔ اور دوسرے اجتماعی مقاصد کے مطابق حالات کا پیدا کرنا جن میں افراد کو انتخاب کا زیادہ سے زیادہ حق حاصل ہو، کچھ مناسب نہ تصور کیا جائے۔ اور اس لیے یہ واضح کر دینے سے ہی کہ متعین حالتوں میں اس قسم کی

زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ بات کچھ لازمی نہیں ہو جاتی کہ ان حالات کی تلاش بھی کی جائے۔

اور پھر اجتماعی مقاصد کا تعین اگر صرف اسی معیار پر ہو کہ لوگ کن چیزوں کے لئے قیمتیں ادا کرنے کو تیار ہیں تو اس سے بعض خرابیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً توازن کے رجحانات کے بروئے کار آنے کے لیے ایک قانونی نظام کی ضرورت ہے لیکن یہ قانونی نظام صرف اس معیار پر تعمیر نہیں کیا جا سکتا کہ معاشرت کے افراد اس نظام کی خدمات کے لیے کتنی رقم خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ مکمل صحت یا چھوت کی بیماریوں سے تحفظ محض انفرادی کوششوں سے ممکن نہیں۔ شہروں میں اگر محض چند افراد صحت و صفائی کے اصولوں کی پوری پابندی نہ کریں تو ساری شہری آبادی وبائی بیماریوں کا شکار ہو سکتی ہے۔ اس طرح کے مقاصد کے حصول کے لیے افراد کی آزادی پر ضرور پابندی لگانی ہوگی۔ اور ذرائع پیداوار کی ایسی تقسیم کرنی ہوگی جو شاید افراد کی اپنی پسند کے عین مطابق نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ معاشرت کو اس طرح کے مقاصد بھی متعین کرنے کا پورا حق ہوتا ہے۔ جو افراد کی انفرادی آزادی پر اس سے زیادہ سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ اور معاشی تحلیل میں کوئی ایسا معیار نہیں جس پر جانچ کر ہم ان مقاصد کو اچھا یا برا کہہ سکیں۔

ہاں جب مقاصد کا تعین ہو لے تو معاشیات یہ بتانے میں پوری مدد کر سکتی ہے کہ ذرائع پیداوار کی کون سی تقسیم ان مقاصد

کے حصول کے لیے ضروری ہوگی۔

یہی سبب ہے کہ کسی طرز عمل کو "معاشی" یا "غیر معاشی" کا خطاب دینا بہت سی غلط فہمیوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہماری منتخب کردہ تعریف کے مطابق تو کسی عمل کے "معاشی" ہونے کا معیار بس یہ ہے کہ متعین مقاصد کو کم سے کم ذرائع کے استعمال سے حاصل کیا جائے۔ اس لیے یہ کہنا تو بالکل صحیح ہوگا کہ فلاں طرز عمل "غیر معاشی" ہے کیوں کہ اس کے مطابق متعین مقاصد کے حصول کے لیے کم یاب اشیا، کی غیر ضروری مقدار خرچ کرنی ہوگی۔ یعنی اگر مقاصد کا تعین ہو سے تو ان کے حصول کے لیے ذرائع پیداوار کے استعمال کو "معاشی" یا "غیر معاشی" کہا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ صفتیں خود مقاصد کے لیے استعمال نہیں کی جا سکتیں جیسا کہ ہم اوپر کہ آئے ہیں۔ دنیا میں مطلق معاشی مقاصد کا وجود نہیں۔ ہاں مقاصد کو حاصل کرنے کے طریقے اچھے یا بُرے ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ متعین مقاصد کے حصول کی کوششیں ایک غیر معاشی فعل ہیں۔ ہاں اگر ان مقاصد کے حصول کے لیے ذرائع پیداوار کی ایک غیر ضروری مقدار خرچ کی جائے تو یہ فعل ضرور غیر معاشی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً جنگ کی بدولت جو قربانیاں قوم کو برداشت کرنی پڑیں گی۔ ان سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود قوم بعض اصولوں کی حمایت کے لیے جنگ کو ناگزیر سمجھے تو یہ قطعاً جائز

نہیں کہ ہم لڑائی کو ایک غیر معاشی فعل کہیں۔ کیوں کہ مقاصد کا تعین معاشیات کا کام نہیں۔ لیکن اگر جنگ کے لیے معاشرہ کی معاشی زندگی اس طرح منظم کی جائے کہ ضروری چیزیں کم پیدا ہوں، یا دیر سے پیدا ہوں اور اس طرح معاشرے کو غیر ضروری قربانیاں کرنی پڑیں، تو یہ تنظیم ضرور غیر معاشی کہی جا سکتی ہے۔

اسی طرح اگر ہم یہ مان لیں کہ حکومت کا مقصد ایسے حالات کا تحفظ ہونا چاہیے۔ جس میں افراد کی مانگیں زیادہ سے زیادہ سہولت سے پوری ہوں تو بعض غیر معمولی حالات سے قطع نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گیہوں پر ایک تامینی ٹیکس ایک غیر معاشی فعل ہے، کیوں کہ اس سے ہمارے اصل مقصد کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ تامین کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیرونِ ملک سے گیہوں کی مقدار درآمد کم ہوجاتی ہے۔ اور قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔

لیکن اگر افراد کی انفرادی خواہشوں پر بعض دوسرے مقاصد کو ترجیح دی جائے ـــــ مثلاً جنگ کی صورت میں غذائی رسد کا یقین۔ تو صرف یہ بات کہ تامین سے صارفین کو نسبتاً نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے لیے کافی نہیں کہ ہم تامین کو ایک غیر معاشی طرزِ عمل قرار دے دیں۔ ایسی صورت میں تامین کو ایک غیر معاشی طرزِ عمل صرف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے، جب یہ ثابت ہوجائے کہ اب بھی صرف اصل مقصد کو ذرائع کی ایک غیر ضروری قربانی کی مدد سے حاصل کیا جا رہا ہے۔

اب ہم ذرا کم ترین اجرت کی تنظیم کے مسئلے پر بھی ایک

نظر ڈالیں گے۔ نظری معاشیات کا یہ ایک مشہور کلیہ ہے کہ اگر اجرت کی شرح توازن سے زیادہ کر دی جائے تو اس کا نتیجہ لازماً بے روزگاری اور سرمایے کی قیمت میں کمی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ یہ کلیہ معاشی توازن کے نظریے کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اور پچھلی جنگ کے بعد سے اس ملک کی معاشی تاریخ نے اس کی سچائی پر مہر لگا دی ہے۔

ایک خیال کے مطابق جس نے عام لوگوں کے دماغ میں جڑ پکڑ لی ہے۔ یہ استنباط کہ اجرتوں کے اضافے سے بے روزگاری کے بڑھنے کا اندیشہ ہے، ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ اجرتوں میں اضافے کی وجہ سے ذرائع پیداوار میں اصلاحات کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس طرح نئی مشینیں استعمال کی جانے لگیں گی۔ اور نئی چیزیں بننے لگیں گی۔ بے روزگاری کا اندیشہ نتیجہ ہے ان تبدیلیوں کو ذہن میں نہ رکھنے کا۔ اگر یہ رائے صحیح بھی ہو تو بھی یہ بات تو تسلیم کرنی پڑے گی کہ خود یہ "اصلاحات" سرمایے کی تضیع کی مثال ہیں۔

لیکن پھر بھی اس طرح کا اقدام لازماً غیر معاشی نہیں۔ اگر قوم کا یہ خیال ہو کہ اجرت کی ایک کم ترین شرح مقرر کر دینے سے جو فائدے ہوتے ہیں وہ بے روزگاری، اور دوسرے نقصانات کی کافی تلافی کر دیتے ہیں تو اس کے ضابطے کو ہم غیر معاشی نہیں کہہ سکتے۔ ہم بحیثیت ایک ایک فرد کے تو ضرور یہ رائے رکھ سکتے ہیں کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم میں کمی

کرنا ایک غلط مقصد ہے۔ اور اس طرح ہم پیداوار میں کمی
کرا کے سب کی خوشی میں جو اضافہ ہونے والا تھا، اسے کم کیے
دیتے ہیں۔ اور ہم اس میں بھی آزاد ہیں کہ ہم اس رائے
کے حامیوں کو تخیل کی قوت سے محروم سمجھیں۔ لیکن ہم اپنی
ان راؤں کو معاشیات کی مدد سے ثابت نہیں کر سکتے۔
کیوں کہ مقاصد کے تعین میں معاشیات بالکل غیر جانب دار ہے۔

۴۔ عہدِ حاضر کے بعض اساتذۂ معاشیات نے اسی
نقص کو دور کرنے کے لیے کہ معاشیات سے ہمیں ایسے اصول
نہیں ملتے، جن پر عمل کرنا عملی زندگی میں لابدی اور ضروری
ہو، معاشیات کے موضوع کو اور وسیع بنانے کا مشورہ
دیا ہے، ہاٹرے اور ہابسین کی رائے میں معاشیات کو اخلاقی
اصولوں اور افراد کی تعین قیمت کو بس تسلیم کر کے نتائج سے بحث
ہی نہیں کرنی چاہیے بلکہ خود ان کی اہمیت کے متعلق بھی رائے
دینی چاہیے۔ مسٹر ہاٹرے کی رائے کے مطابق "معاشیات کو
اخلاقیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا!"

لیکن ان دونوں علوم کو ہم پہلو بہ پہلو تو ضرور رکھ سکتے
ہیں مگر یہ ممکن نہیں کہ ہم انھیں اور کسی طرح اکٹھا کر سکیں۔ معاشیات
کا تعلق ایسی باتوں سے ہے جن کی سچائی یا جھوٹ کا پتہ لگایا جا سکتا
ہے، اخلاقیات کا تعلق فرائض اور اساسی قدروں سے ہے۔ اور علم
کی یہ دونوں شاخیں دو مختلف قسم کے مباحث سے تعلق
رکھتی ہیں۔ اثباتی اور ذوقی علوم کے کلیات

میں ایک ایسا منطقی تضاد ہے جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے اور جسے ہم کسی طرح بھی مٹا نہیں سکتے۔ اس قضیے کی بنیاد کہ قیمت چیز کی طلب و رسد کی مقدار میں تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، آخر میں انسان کی پسند پر ہے۔ اور ہم ذاتی مشاہدہ نفس، یا عام مشاہدے کی مدد سے اس کی صحت یا عدم صحت متعین کر سکتے ہیں، ہم لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں کہ کن کن قیمتوں پر وہ کتنا گوشت خریدنے کے لیے تیار ہوں گے۔ یا ہم بازار جاکر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کن قیمتوں پر لوگ کتنا گوشت خریدتے ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ کہ یہ گوشت حرام ہے یا حلال۔ ان دونوں طریقوں میں سے کسی کی بھی مدد سے حل نہیں ہو سکتا۔ بعض قومیں اسے حرام سمجھتی ہیں، بعض حلال۔ اور یہ تصور کہ ایک کام جائز ہے یا ناجائز۔ افراد کی ذاتی رائے کا معاملہ ہے۔ "کیا ہے" اور "کیا ہونا چاہیئے" یہ دو جداگانہ قسم کے مسائل ہیں۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ان دو اتنے مختلف النوع مسائل کو علاحدہ نہ کرنے یا ان کے بنیادی اختلاف کو نظر انداز کرنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ معاشیات کے طالب علم مختلف قدروں کو اپنے استدلال کی بنیاد کے طور پر بھی استعمال نہیں کر سکتے اور ان کو اپنا نقطۂ آغاز بنا کر عمل کی مختلف تجویزوں پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس کے برخلاف

جیسا کہ ابھی واضح ہو جائے گا۔ معاشیات کی افادیت کا راز اسی نکتے میں مضمر ہے کہ اس کی مدد سے مختلف بنیادی قدروں کی اہمیت اور صحت واضح ہو جاتی ہے۔ عملی معاشیات کے مسائل کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو تو تمہیں یہ کرنا چاہیئے۔ اگر یہ بنیادی قدریں تسلیم کر لی جائیں تو خلاف طریق کار ان سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ ہماری ساری بحث کا مقصود محض اس نکتے کی وضاحت کرتا ہے۔ کہ ایسے مفروضات کی صحت یا عدم صحت جو کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہونا چاہیئے کے مسائل سے تعلق رکھتے ہوں جانچی نہیں جا سکتی اس کے بر خلاف کیا ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جس کے متعلق اختلاف رائے مٹایا جا سکتا ہے۔

اس گفتگو کا منشا یہ نہیں ہے کہ معاشیات جاننے والوں کو اس کا حق نہیں کہ وہ اخلاقی سوالات کے متعلق کسی رائے کا اظہار نہ کریں۔ ایسے ہی بناتیات کو جمالیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نباتیات کے ایک ماہر کو اس کا حق نہیں کہ باغ میں کیاریوں کی ترتیب یا پھولوں کی قسموں کے متعلق کوئی رائے ہی نہ رکھے۔ اس کے برخلاف استاد معاشیات کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے کہ وہ ان مسائل پر خوب غور و خوض کرے۔ تاکہ جب کبھی اس کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہو تو وہ اس کے سارے پہلوؤں سے واقفیت کی بنا پر ٹھیک یہ بتا سکے کہ مختلف مقاصد کے

حصول پر کسی ایک عمل کا نتیجہ کیا ہو گا۔ ممکن ہے جان اسٹوآرٹ مل کی یہ رائے صحیح نہ ہو کہ "کوئی شخص جسے اور کچھ نہ آتا ہو، ایک اچھا ماہر معاشیات نہیں ہو سکتا" لیکن کم سے کم اس پر تو ہم سب متفق ہو جائیں گے۔ کہ ایسی صورت میں معاشیات کے ایک ماہر سے اتنا فائدہ نہیں پہنچ سکے گا جو دوسری صورت میں پہنچ سکتا۔ ہمارے طریق کار کے اصولوں میں دوسرے مسائل سے دل چسپی لینا ممنوع نہیں ہے۔ مقصد تو صرف اتنا ہے کہ یہ دونوں مسائل، ایک دوسرے سے اپنی ماہیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں، اور اس لیے ان میں ایک کی مدد سے دوسرے کی نتائج کی تائید یا تردید نہیں کی جا سکتی۔

طریق کار کے مسائل سے قطع نظر نقطۂ نظر کی تائید کے لیے عملی سہولتوں کی ایک بہت ہی معقول وجہ بھی موجود ہے۔ سیاسی کشمکش کے ہنگاموں میں اختلاف رائے کا باعث مقاصد بھی ہو سکتے ہیں اور طریق کار بھی۔

پہلی قسم کے مسائل کا حل نہ معاشیات کے پاس ہے نہ کسی اور علم کے پاس۔ اگر ہم مقاصد کے متعلق مختلف الخیال ہوں تو اس کا فیصلہ طاقت کے استعمال سے ہی ہو سکتا ہے۔ اگر میں آپ کو قتل کر سکوں تو میری رائے صحیح ورنہ آپ کی۔ یا پھر جو کم زور ہو از خود جھک جائے۔ لیکن اگر طریق کار کے متعلق اختلاف رائے ہو تو اکثر صورتوں میں علمی تحلیل اختلاف رائے کے مٹانے میں معاون ہو سکتی ہے۔ اگر ہم سود کے جواز

یا عدم جواز کے متعلق مختلف الرائے ہوں تو کوئی دلیل و حجت نہیں دے سکتی، لیکن شرح سود میں تبدیلیوں کے مفروضی نتائج زیر بحث ہوں۔ تو اس قضیئے کے طے کرنے میں معاشی تحلیل کو ضرور کامیاب ہو جانا چاہیئے۔ اگر مسٹر ہاٹرے کو ایک کمیٹی کا سکریٹری بنا دیا جائے۔ جس کے ممبروں میں بنتھم، گوتم بدھ، لینن اور امریکہ کے فولاد کے کارپوریشن کے صدر بھی ہوں اور ان سے خواہش کی جائے کہ ربا کے اخلاقی پہلو پر روشنی ڈالیں تو یہ قرین قیاس نہیں کہ وہ متفق الرائے ہوکر کوئی رپورٹ پیش کر سکیں۔ لیکن اسی کمیٹی کے ذمے اگر اس مسئلہ کا حل معلوم کرنے کا کام دے دیا جائے کہ اگر حکومت بٹہ کی شرح پر قانونی پابندیاں عائد کر دے تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ تو اس صورت میں اگر مکمل اتفاق رائے نہیں تو اکثریت کی تائید کے ساتھ ایک رپورٹ تو ضرور ممکن ہونی چاہیئے، اور یقیناً ایک ایسی دنیا میں جہاں ایسے اختلافات بھی جن سے بچا جا سکتا ہے بہت عام ہیں یہ بڑی اچھی بات ہوگی کہ مسائل تحقیق کی ایسی حد بندی کر دی جائے جس کے ایک طرف اتفاق رائے ہو اور دوسری طرف باہمی اختلاف یا دوسرے الفاظ میں سائنس کے غیر جانب دار رقبے کی فلسفۂ سیاسیات اور اخلاقیات کے نزاعی مسائل سے الگ حد بندی کر دینا بڑا مفید ہوگا۔

۵۔ لیکن پھر معاشیات کی اہمیت کیا رہ گئی، اس کے

کلی قوانین کوئی ایسا معیار ہمارے سامنے نہیں رکھتے جن کی پابندی عملی زندگی میں لازمی ہو، اور نہ ہم ان کی مدد سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سے مقاصد پسندیدہ ہیں کون سے مردود۔ معاشیات اخلاقیات سے بنیادی طور پر مختلف ہے تو آخر پھر اس کی اہمیت کیا ہے؟

معاشیات کی اہمیت بس صرف اتنی ہے کہ جب ہمیں دو ایسے مقاصد میں سے جو دو مختلف اساسی قدروں کے مظہر ہوں، ایک کو منتخب کرنا ہو تو ہمارا یہ انتخاب نتائج سے پوری واقفیت پر مبنی ہو۔ دو مقاصد میں کسی ایک کو ترجیح دینے کا جب سوال ہو تو معاشیات کوئی قطعی فیصلہ کر نہیں سکتی۔ انتخاب کا کام ہمیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ترجیح کا مسئلہ کوئی بھی سائنس حل نہیں کر سکتی، لیکن عقلمندی کا اقتضا یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی چنیں یہ اچھی طرح جان بوجھ کر کہ ہم کیا چن رہے ہیں، مختلف امکانی شکلوں میں سے ایک کو پسند کرنے کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں؟ معاشیات کی عملی اہمیت بس اتنی ہے کہ وہ ہمیں نتائج سے باخبر بنا دیتی ہے، اور ہمیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ جو کچھ بھی چاہیں اس کے متعلق پورا پورا علم حاصل کر لیں، اور اس طرح ہم ایسے مقاصد چن سکتے ہیں جو باہم ہم آہنگ ہوں۔

ہمارا مقصد چند مثالوں کی مدد سے واضح ہو جائے گا۔ پہلے ایک ایسی مثال لیجیے۔ جس میں محض ایک انتخاب کے

اور اس کے لئے ایک موزوں مثال
نتائج کی توضیح ضروری ہو،
یہ تو ہم ابھی کہ آئے ہیں کہ معاشیات
تامینی محصولوں کی ہے۔
ایک سائنس کے کوئی بات ایسی نہیں جو
میں بہ حیثیت
اور اگر اس کے نتائج اور
تامین کو برا یا بھلا ثابت کر سکے۔
"ادران" تکلیفوں سے پوری واقفیت کے باوجود جو اس پالیسی
کے نتیجے کے طور پر عوام کو برداشت کرنی پڑیں گی، ایک
قوم اس حکمت عملی کو پسندیدہ قرار دے تو یہ عمل
معاشیات کی بارگاہ سے مردود قرار نہیں دیا جاسکتا، کیوں کہ
اگر قوم کے افراد مل کر مدافعت، دیہی زندگی کے
تحفظ یا ایسے ہی کسی اور مقصد کو اپنی انفرادی آزادی
سے زیادہ دقیع سمجھیں تو ہم ان کے طرز عمل کو معاشیات کی رو
سے غلط یا صحیح ثابت نہیں کر سکتے، خصوصاً اگر اس طرز عمل کی
پسندیدگی اس کے نتائج و عواقب سے بے خبری کا نتیجہ نہ ہو
اور ایک وسیع قوم میں یہ علم صرف معاشیات کی ایسی
تفصیلی توضیح کی مدد سے ہی حاصل ہو سکتا ہے، جو مسئلے کے ہر
پہلو کو پوری طرح اجاگر کردے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت
سے بھی اگر زراعت کی تامین کے متعلق رائے لی جائے تو
ان کے مشورے کی بنیاد صرف اس پر ہوتی ہے کہ تامین یافتہ
صنعت کے لیے اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ اگر نتائج مفید
ہوں گے۔ تو وہ تامین کی حمایت میں اپنی رائے دیدیں گے
مگر یہ بات تو معمولی عقل رکھنے والے آدمی کی بھی سمجھ میں

آجانی چاہیئے کہ اس مسئلے کے اہم تر مسائل تو ابھی زیر بحث آتے ہی نہیں۔ تاہین کے اور کیا نتائج ہوں گے۔ ایسی قوم میں جہاں معاشی زندگی کے مختلف پہلو اس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ کہ ایک پہلو بھی اگر کسی چیز سے متاثر ہو تو یہ اثر رفتہ رفتہ ساری معاشی زندگی میں پھیل جاتا ہے، اور ان اثرات کا پتہ لگانے کے لیے معاشی تحلیل کی مدد درکار ہے۔ شاید عواقب کی لاعلمی کا ہی نتیجہ ہے کہ ان ممالک میں جہاں معاشیات کی تعلیم کا معیار کچھ اونچا نہیں۔ تاہینی محاصل بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

لیکن معاشی توضیح کی افادیت صرف اتنی نہیں کہ اس کی مدد سے ہم اس طرح کے سیدھے سادھے مسائل، جیسے کسی ایک صنعت کی تاہین، سے پوری واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم معاشیات کی مدد سے ٹیڑھے مسائل سے بھی پوری واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً کون سے مقاصد ساتھ ساتھ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اور کون سے مقاصد باہم متصادم ہوتے ہیں یا یہ کہ مقاصد کی ہم آہنگی کن شرائط پر مبنی ہے وغیرہ۔ اور ان مسائل کے حل کرنے کے لیے، اگر عقل و فراست کا دامن ہم ہاتھ سے دینا نہ چاہیں، تو علمی تحلیل کے ایک ایسے نظام کی موجودگی ناگزیر حد تک ضروری ہے جو ان مسائل کو واضح کر دے اگر متعین اجتماعی خواہشات انفرادی اندازۂ اہمیت یا قیمت کے مخالف بھی ہوں تو ان

کی تکمیل بغیر کسی توضیح کے بھی شاید کچھ بہت دشوار نہ ہو، اہم ترین اغذیہ کی حفاظت کے لیے مالی امداد اس کی ایک اچھی مثال ہے، لیکن بغیر اس طرح کی توضیح کی مدد کے کسی اس سے زیادہ پیچیدہ پالیسی پر کامیاب عمل درآمد کرنا تقریباً ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔

زر کے متعلق طرزِ عمل کا تعین ایسا ہی ایک پیچیدہ سوال ہے، نظریۂ زر کے بہت ہی معمولی اصولوں کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایک ایسی دنیا میں جہاں مختلف کرنسی رقبوں میں تبدیلیوں کی رفتار مختلف ہے۔ بہ یک وقت اندرونی ملک کی قیمتوں اور بیرونی سکوں سے شرح مبادلے کا ٹھیراؤ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں مقاصد جو پالیسی کے مختلف معیاروں کا نتیجہ ہیں ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کے حصول کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن بہ یک وقت دونوں کے حصول کی کوششیں کرنا محض نادانی ہوگی۔ جس کا لازمی نتیجہ نظامِ زر کی کارکردگی میں خرابی کی شکل میں ظاہر ہوگا یہ باتیں معاشیات کے سبھی طالب علم اچھی طرح جانتے ہیں، لیکن معاشی تخیل کی مدد کے بغیر ہم میں سے کتنے ان دونوں مقاصد کے باہمی تضاد سے واقف ہو سکتے تھے؟

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ مثال بھی نسبتاً معمولی سی مثال ہے۔ معاشیات کی مدد کے بغیر معاشی زندگی دو نظاموں

میں سے کسی ایک کا چننا بھی ممکن نہیں۔ ہم اوپر کہ آئے ہیں کہ اگر ایک معاشرہ کے نزدیک غیر مساوی تقسیم دولت ایک بری بات ہو اور وہ اقدامات جو اس تقسیم کو مٹا سکیں سماجی پالیسی کے مقاصد کی جگہ حاصل کرلیں تو ہم اس انتخاب کو غیر معاشی نہیں کہ سکتے۔ ہاں اگر عواقب سے پوری واقفیت حاصل کیے بغیر یہ اقدامات پسندیدہ قرار دے دیے گئے ہوں تو ہم اس انتخاب کو فراست یا عقلمندی کا ثبوت نہیں قرار دے سکتے۔ اور ایسا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم سرمایہ دارانہ نظام کی ماہیت سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرلیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اس کی جگہ ہم جس نظام کو رائج کرنا چاہتے ہیں اس میں کیا کمزوریاں ہوں گی اور وہ کن حالات یا شرائط کے ساتھ کام کرسکے گا۔ یہ عقل مندی نہیں کہ ہم بغیر یہ جانے ہوئے کہ کسی ایک مقصد کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنانے سے ہمیں اور کیا کیا کھونا پڑتا ہے۔ اپنا مقصد بنالیں۔ اور مختلف امکانات کی اہمیت اور قیمت کا اندازہ لگانے میں موجودہ معاشی تحلیل کی عطا کردہ روشنی ہی ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرسکتی ہے۔

اگر معاشیات کو واقعی یہ رتبہ حاصل ہے تو اس کے لیے اونچا درجہ کیوں مانگا جائے، کیا ہمارے عہد کی یہ سب سے بڑی مصیبت نہیں کہ ہمیں یہ پتہ نہیں کہ ہم کس طرف جارہے ہیں، کیا کررہے ہیں۔ کیا ہماری بیشتر مصیبتیں اسی

ایک غلطی کا نتیجہ نہیں کہ ہماری خواہشات باہم متصادم ہوتی ہیں محض اس لیے کہ ہم یہی نہیں جانتے کہ کون سے مقاصد ہم آہنگ ہوسکیں گے۔ اور کون سے نہیں؟ شاید یہ صحیح ہو کہ اب بھی ہماری موجودہ سوسائٹی میں اساسی قدروں کے متعلق ایسے اختلافات باقی ہیں جو تصادم کو ناگزیر بنا دیتے ہیں، لیکن یہ کہنا صحیح ہوگا۔ کہ ہماری بیشتر دقتیں اس قسم کے اختلافات کا نہیں، بلکہ صرف اس کا نتیجہ ہیں کہ ہمارے مختلف مقاصد باہم مربوط نہیں کیے گئے ہیں۔ صارفین دولت کی حیثیت سے ہم سستی چیزیں چاہتے ہیں، اور دولت کے پیدا کرنے والوں کو سلامتی کی خواہش ہے۔ انفرادی نقطۂ نظر سے ہم ذرائع پیداوار کی ایک تقسیم کو پسند کرتے ہیں، اور ایک معاشرے کے فرد کی حیثیت سے ہم ایسے انتظامات کی تائید بھی کرتے ہیں جو اس تقسیم کو بےکار بنا دیں۔ ہم معمولی شرح سود، اور سستی چیزوں کے یعنی کم سے کم تجارت درآمد اور ساتھ ہی ایک بڑی سے بڑی مقدار تجارت کے خواہش مند ہیں، خواہشات کے لحاظ سے ہمارے معاشرے کی یہ تقسیمیں مختلف مرجحات کی حمایت کرتی ہیں، اس لیے نہیں کہ یہ مختلف افراد کی خواہشات کا مجموعہ ہیں، بڑی مصیبت تو یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی زندگی کے ایک پہلو پر نظر رکھتے ہوئے اپنے کسی ایک مفاد کے پیش نظر ایک بات چاہتا ہے، اور اپنی دوسری دلچسپیوں

اور اپنے دوسرے مفاد کے پیش نظر ایک دوسری بات۔

معاشیات اس ناپسندیدہ صورت حالات کو ختم کرنے کے لیے ہمیں علم کی قوت دیتی ہے۔ اس کی مدد سے مختلف حکمت عملیوں کے سارے دور رس نتائج ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ انتخاب کی زحمت سے تو بیشک معاشیات ہمیں نجات نہیں دلاتی، نہ دلا سکتی ہے، ہاں وہ یہ ضرور ممکن بنا دیتی ہے کہ ہم ایسے مقاصد چنیں جو ہم آہنگ ہو سکیں۔ انسانی زندگی پر جو پابندیاں قدرت نے عائد کر دی ہیں ان سے تو ہمیں نجات نہیں ملتی۔ لیکن ان پابندیوں میں رہ کر بھی ایسی راہ چننا، جس میں کہیں کوئی تصادم نہ ہو، معاشیات ضرور ممکن بنا دیتی ہے۔ اس ملی جلی دنیا کے مسائل سمجھنے کے لیے معاشیات ہماری بصیرت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور ہمیں دانش مندانہ عمل کے لیے ایک مشعل ہدایت عطا کرتی ہے۔

معاشیات عقلیت کو انسانی زندگی کی ایک بنیادی قدر سمجھتی ہے، وہ یہ ثابت کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کرتی کہ ہمارا عمل ہمیشہ اس معنی میں دانش مندانہ ہوتا ہے کہ ہماری مختلف خواہشات میں کوئی ٹکر نہیں ہوتی، نہ اس کے قوانین کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اساسی قدروں کے تعین کی بحث میں بھی ضرور حصہ لیں اور نظری معاشیات کی افادیت ہرگز اس مفروضہ پر مبنی نہیں کہ لوگ ہمیشہ سوچ سمجھ کر ہی کوئی کام کریں گے

لیکن یہ ضرور ہے کہ معاشیات کی ساری علمی افادیت اس پر ضرور منحصر ہے۔ اگر لوگ سوچ سمجھ کر کام کریں تو یہ بڑی پسندیدہ بات ہوگی، معاشیات کی ساری بحثوں کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ ہم ایسے مقاصد چننے کی کوشش کریں جن کا حصول کسی تصادم کے بغیر ممکن ہو۔

اس معنے میں معاشیات اپنے وجود کے لیے نہیں تو اپنی افادیت اور اہمیت کے لیے ضرور ایک اساسی قدر پر بھروسہ کرتی ہے کہ جب ہمیں کئی راہوں میں سے ایک چننی ہو تو ہم ہمیشہ سوچ سمجھ کر اور پوری واقفیت حاصل کرنے کے بعد قدم اٹھائیں۔ اگر ناسمجھی، اور اضطراری حرکتیں انسانی کردار کا معیار بن جائیں تو بلاشبہ معاشیات کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ اور یہ ہمارے عہد کی بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو بے سمجھی اور صحیح انتخاب کی عدم ضرورت کو زندگی کا اصول سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لیے دلیل وحجت بے کار ہے۔ دلیل وحجت کے خلاف جہاد در اصل زندگی کے خلاف جہاد ہے، لیکن اس خطرے کے پیش نظر ان لوگوں کے لیے جو مثبت قدروں میں اب بھی ایمان رکھتے ہیں۔ علم کی وہ شاخ جو سبھی علوم سے زیادہ اجتماعی زندگی کی تنظیم میں عقلیت کو مشعل ہدایت بنانا چاہتی ہے۔ اور بھی زیادہ اہم اور ضروری ہو جاتی ہے:

ہماری زبان

انجمنِ ترقیٔ اُردوٗ (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہی

قیمت سالانہ ایک رُپیہ فی پرچہ ایک آنہ

اُردوٗ

انجمنِ ترقیٔ اُردوٗ (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہی

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہی، تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اردوٗ میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہی۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زائد ہوتا ہی قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات رُپے سکۂ انگریزی (آٹھ رُپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے۔ (دو رُپے سکۂ عثمانیہ)

معاشیات

انجمنِ ترقیٔ اُردوٗ کا ماہانہ رسالہ

"معاشیات" میں علم معاشیات سے متعلق بلند پایہ مضامین اور مقالے شائع ہوتے ہیں۔ ہندستان، غیر ممالک نیز بین الاقوامی دنیا کے معاشی مسائل اور حالاتِ حاضرہ پر سنجیدہ اور علمی انداز میں بحث کی جاتی ہی۔ قیمت سالانہ پانچ رُپے (صہ/)

ملنے کا پتا:۔ دفتر انجمن ترقیٔ اُردوٗ (ہند) ۱۲ دریا گنج دہلی